فہرست

دیباچہ

قاضی عبدالغفار جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند)

"یہ مقدمہ بازی" یا مقدمہ نویسی بڑی ہی ٹیڑھی کھیر ہے۔ "عرش" صاحب نے جب اپنے "پوسٹ مارٹم" پر دیباچہ لکھنے کی فرمائش کی تو میں نے یہ سوچا کہ زیادہ لطف اس پوسٹ مارٹم میں اس وقت آتا کہ خود عرش صاحب نے اپنا "پوسٹ مارٹم" کر ڈالا ہوتا۔ (میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو پوسٹ مارٹم عرش صاحب کا ہوا بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو پوسٹ مارٹم انھوں نے دوسروں کا کیا!) تنقید کرنے کی فرمائش کی تو میں نے

ایک دفعہ میں نے اپنی کتاب روزنامچہ میں (Sense of humour) کا اپنا تصور اس طرح پیش کیا تھا۔

"لاکھوں برس پہلے جب ہنوز انسان جنگلوں میں ننگا پھرتا تھا۔ کیا ہی اچھے تھے وہ دن — جب درختوں پر اور غاروں میں زندگی بسر کرتا تھا ایک دن اس کی صحرائی آبادی میں ایک انسان درخت کی بلند شاخ سے زمین پر گر پڑا۔ اس کے دوسرے ساتھی دوسری شاخوں پر جھول رہے تھے اور اس کو کیچڑ میں سنا ہوا دیکھ کر خوب ہنسے۔ ان میں سے ایک ہنستے ہنستے بے قابو ہو کر کیچڑ میں گر پڑا۔ ہنسنا بھول گیا کچھ چوٹ بھی لگی۔ کیچڑ میں لت پت ہو گیا منہ پھلائے ہوئے اٹھا اور صحرائی چشمے کی طرف چل دیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ چشمے کے پانی سے اپنا جسم صاف کرے۔ مگر کنارے پر پہنچ کر اس چشمے کے شفاف پانی میں اسے اپنا عکس نظر آیا — کیچڑ میں لت پت ہاتھ پاؤں تھڑے ہوئے ناک پر مٹی کا ایک تودا چپکا ہوا ہیئت کذائی نہایت تمسخر انگیز — وہ پانی پر اپنے اس عکس کو دیکھ کر بے اختیار

ہنس پڑا۔ چوٹ کھا کر اور دوسروں کی ہنسی کا نشانہ بن کر بھی وہ ہنس پڑا۔ اس وقت پہلی دفعہ انسان نے جرأت مردانہ کی بہترین مثال پیش کی۔ یہ جرأت کہ اپنے ہی دکھ اور اپنی ہی چوٹ پر ہنس پڑے۔ اصل یہ ہے کہ اپنی حماقت کے تکلیف دہ نتائج پر ہنسنا ہے بہت مشکل کام اور جو لوگ ایسا کر سکتے ہیں ان کی جوانمردی میں کلام نہیں"۔

اب بھی میرا یہی خیال ہے کہ مزاح کا صحیح ذوق وہی ہے کہ ہم خود اپنے خلاف دوسروں کے مزاح سے لطف اندوز ہو سکیں۔ بذلہ سنجی۔ مزاح اور ظرافت آج کل دو قسم کی ہے ایک مصنوعی (اہل قلم کا پیشہ) اور ایک فطری۔ یہ کہنے کی بات تو نہیں مگر کہہ دوں کہ اردو زبان کے لکھنے والوں میں دو چار کے سوا سب مصنوعی اور پیشہ ور ہیں۔ مزاح اس لیے لکھتے ہیں کہ مزاح لکھنا ان کا پیشہ ہے۔ ان اصحاب کو اکثر اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا کہ مزاح اور بد مذاقی کے درمیان خط فاصل کس قدر باریک ہوتا ہے۔

اس مجموعے کا پہلا مضمون "شعراء کی بذلہ سنجیاں" فطری مزاح اور تفنن کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ عرش صاحب مشاعروں کے متعلق خود اپنے تجربات (یعنی وہ لطائف و ظرائف جن سے انہیں ذاتی طور پر واسطہ پڑا) پوری تفصیل کے ساتھ لکھ دیتے تو اس کتاب کی ادبی حیثیت میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا۔

فطری (Sense of humour) کا کمال یہ ہے کہ کوئی شخص گالی کھا کر ہنس دے۔ بعض اوقات لوگ اسے بزدلی یا بے غیرتی کہیں گے لیکن غور سے دیکھیے تو اس کے اندر مردانگی اور بہادری کا بھی ایک پہلو ہے۔ کوئی کڑا فقرہ چست ہو جائے یا کسی ذہین آدمی کے لئے بے اختیار جواب کی زد میں اگر کوئی شخص محفل کے لیے سامان تفریح بن جائے اور پھر بھی مسکراتا رہے اور ہنستا رہے ــــ کھسیانی ہنسی نہیں، وہ تو اور بات

ہے) تو ایسا آدمی صحیح معنوں میں صاحب ذوق سمجھا جائے گا۔

عرش صاحب نے اچھا کیا کہ بہت سے ایسے گزرے ہوئے واقعات کو ان اوراق میں جمع کر دیا جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے تبسم آفریں ہیں۔ لیکن ان اوراق کو پڑھ کر مجھے یہ خیال آیا کہ اگر ہو سکے تو میں مزاح و تفنن کے ایسے تمام واقعات قلمبند کر دوں جو مجھے پیش آئے ہیں یا جن کی زد میں آیا۔ جس طرح مولانا شوکت علی کے تخلص کا واقعہ عرش صاحب نے لکھا ہے۔ ایک دفعہ پولیس نے قتل کے الزام میں مجھے گرفتار کر لیا۔ ہوا یہ کہ وہ کسی ایسے ملزم کی تلاش میں تھی جس کی صورت میرے حلیے سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی۔ لہذا داروغہ جی سیدھے میرے دفتر میں آئے اور وارنٹ دکھا کر مجھے اپنے ساتھ کوتوالی لے گئے۔ حوالات میں جانا تو نصیب نہ ہوا اس لئے کہ کوتوالی جاتے ہی یہ دلچسپ غلط فہمی دور ہو گئی لیکن مجھ سے پوچھئے کہ مجھ پر کیا گزری۔ غصہ آیا ہو گا؟ پولیس سے جھگڑا کیا ہو گا؟ اعلےٰ حکام سے اس توہین کی شکایت کی ہو گی؟ ۔۔۔ جی نہیں مجھے اس ساری واردات میں بہت لطف آیا۔ قتل کے الزام کا ملزم بن کر پولیس کی گرفت میں تین چار گھنٹے یوں تو بہت بُرے سمجھے جائیں گے لیکن ذرا زاویہ بدل کر دیکھئے تو یہ تجربہ پر لطف معلوم ہوتا ہے اور اس کا مزاحی پہلو بہت نمایاں ہو جاتا ہے۔ کئی دن تک گھر والے اور احباب پولیس پر خفا ہوتے رہے اور مجھے مشورہ دیتے رہے کہ وزیر پولیس سے شکایت کر دوں لیکن میں مزے لے لے کر ہنستا رہا اور کہتا رہا کہ زندگی میں ایسے پر لطف تجربے روز روز تو حاصل ہوا نہیں کرتے! اس واقعہ میں جو بات مزیدار تھی اسے میرے Sense of humour) نے پالیا تھا۔ ایک دفعہ ایک مذہبی بزرگ نے مجھے طبیب سمجھ کر

اپنا خفیہ مرض مجھ سے بیان کر دیا۔ بے اختیار جی چاہا کہ اس ڈھونگ کو چند روز قائم رکھ کر دیکھنا چاہیئے کہ آگے کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کے لئے نسخہ بھی لکھ دیا۔ بعد میں جب یہ راز فاش ہوا تو مولانا بہت بھڑکے لیکن میں نے انہیں سمجھا لیا کہ اس مذاق میں کوئی مجرمانہ بدمذاقی نہ تھی۔ پھر میں اور وہ عمر بھر گہرے دوست رہے۔

ہر طرف چلتے پھرتے انسان کو اپنی زندگی میں ایسے جواہر پارے مل جاتے ہیں۔ بس اتنا ہے کہ سنگریزوں اور جواہر پاروں کے درمیان جو فرق ہے وہ سمجھ میں آ جائے۔

عرش صاحب نے "پوسٹ مارٹم" میں زندگی کے مختلف پہلو پیش کئے ہیں۔ اب میں ان سے کہتا ہوں کہ ایک اور کتاب لکھیں جس میں صرف وہ واقعات لکھیں جو ان پر گزرے ہوں۔ یعنی زیادہ تر ایسے واقعات جن میں تفنن اور مزاح کی زد ان پر پڑی ہو۔ خود اپنی نفسیات کا یہ مطالعہ ہمیں بتایا کرتا ہے کہ ہم اس میدان کے مرد ہیں یا نہیں۔ دوسروں کے خلاف تفنن و مزاح کے پہلو دیکھ لینا نسبتاً آسان ہے لیکن حقیقی (Sense of humour) وہی ہے کہ اپنے متعلق حقائق شناسی کے نقطہ نظر سے یہ دیکھ سکے کہ دوسروں نے ہمیں کس نظر سے دیکھا۔ اردو زبان میں مزاحیہ لٹریچر بہت کم ہے اور جو ہے وہ معیار سے گرا ہوا ہے یا جس میں مذاق اور بدمذاقی کا فرق نہیں سمجھا گیا۔ ہمارے نئے ادیبوں کا فرض ہے کہ ادب کے اس شعبہ میں بھی حقیقی اور فطری تفنن کے مطالعے کی راہیں پیدا کریں۔

محمد عبد الغفار

علی گڑھ - ۲۱ اپریل ۱۹۵۳ء

اپنی صفائی میں

اس مجموعے میں پندرہ مضامین شامل ہیں۔ پہلے اور آخری مضمون کے سوا سب کے سب آل انڈیا ریڈیو دہلی سے وقتاً فوقتاً براڈکاسٹ ہوئے ہیں اور اسی ادارے کے شکریئے کے ساتھ یہ شائع کئے جاتے ہیں۔

ان مضامین میں بیشتر مضامین ایسے ہیں جن کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ خود میری ذات سے ہے۔ قاضی عبدالغفار صاحب نے بہ کمالِ عنایت اس کتاب کا دیباچہ تحریر فرمانے کی زحمت گوارا فرمائی ہے ان کا خیال ہے کہ اس کتاب میں زیادہ تر دوسروں کا پوسٹ مارٹم ہے لیکن میں بہ کمالِ معذرت گزارش کروں گا کہ خود میرا پوسٹ مارٹم بھی اس میں کم نہیں۔ مزاح میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوسروں کا نام لے کر اپنی کہانی بیان کی جاتی ہے۔ یہ وہی سِرِّ دلبراں اور حدیثِ دیگراں والی بات ہے۔ ایک دفعہ ایک رسالے میں میری تصویر پر کسی اور صاحب کا نام چھپ گیا تھا میں نے مدیرِ رسالہ کو لکھا تھا

مجھے اُمیدِ کامل ہے کہ وہ پہچان جائیں گے

جناب ... سے پوچھو کہ یہ تصویر کس کی ہے

ان مضامین کا بھی کہیں کہیں یہی حال ہے اور اس پردے کو اُٹھانے کے لئے صحیح مذاقِ تفنن یا Sense of humour کی ضرورت ہے۔

عرش ملسیانی
۱۵ ۵ ۵۳

شعراء کی بذلہ سنجیاں

زندگی اگر خوش مذاقی، بذلہ سنجی اور مزاح سے خالی ہو تو اسے موت کہنا چاہیئے جو آدمی ارد گرد کی دنیا کو دیکھ کر ہنس نہیں سکتا۔ اپنی باتوں سے دوسروں کو ہنسا نہیں سکتا، وہ گویا ایک جسم جامد ہے، روح سے خالی۔ نہ وہ لطفِ حیات سے خود بہرہ اندوز ہو سکتا ہے نہ اوروں کو اس سے بہرہ اندوز ہونے کے مواقع بہم پہنچا سکتا ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ ہنسنا اصلِ زیست ہے اور دوسروں کو ہنسانا اقتضائے زیست۔ یہ جسم کے بعض امراض کا ہی علاج نہیں بلکہ روح کے لئے بھی اکسیر ہے۔ پھر بھی دنیا کی بوقلمونی کے صدقے بہت سے ایسے خدا کے بندے ملیں گے جو محفل کو ماتم کدہ بنا دیں۔ خوشی کی تقریب پر غم کی بجلیاں گرا دیں ہنسنے والوں کو رُلا دیں۔ کوئی خوش مذاقی کی بات سُنیں تو بسورنے لگیں۔ واہ سے انہیں واسطہ ہی نہیں۔ ہر وقت آہ ہر گھڑی آہ گویا پشتینی مرثیہ گو ہیں۔ ایسے لوگ قابلِ ذکر نہیں اس لئے یہ ذکر ہی فضول ہے۔ لیکن وہ لوگ قابلِ احترام ہیں جو خود ہنستے اور دنیا کو ہنساتے ہیں۔ شعراء کو اس سلسلے میں خاص امتیاز حاصل ہے۔ یہ "ٹُنے کا فرد نے دبنداز" قسم بالعموم بذلہ سنج واقع ہوتی ہے۔ پھر مشاعرہ اور اس کا خاص ماحول ان

کی خوش مذاقی کو اور بھی چار چاند لگا دیتا ہے۔ مشاعروں کی افادی حیثیت سے کوئی لاکھ انکار کرے اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پراگندہ معاشری نظام میں پلی ہوئی اردو شاعری کے چہرے پر اگر تبسم کے آثار ملتے ہیں تو وہ زیادہ تر مشاعرے ہی کے دم سے ہیں۔ مشاعرے میں آپس کی گفتگو، شعر کی برمحل اور بے محل داد، معقول اور غیر معقول اشارے، نقد و تبصرہ، پھبتی، مذاق، بذلہ سنجی اور بداہہ گوئی سب مل جل کر کچھ ایسا لطف پیدا کر دیتے ہیں جس سے مشاعرہ ہماری سوسائٹی کی ضروری تقریب بن گیا ہے اور اچھی شاعری کی تخلیق میں ایک زبردست رکاوٹ ہونے کے باوجود اپنے انھیں لطائف کی بنا پر ابھی تک قائم ہے۔ دوسرے مشاعرہ بازوں کی طرح ہم نے بھی اس دشت کی سیاحی توبہ توبہ اس چمن کی گلگشت کا لطف اٹھایا ہے۔ وہاں جو کچھ آنکھوں سے دیکھا یا کانوں سے سنا اس کا ذکر ہم سے سنئے اور فیصلہ کیجئے کہ یہ شاعر قسم کے لوگ اور ان کا مشاعرہ اس دور میں "غنیمت" چیزیں ہیں کہ نہیں۔

مولانا شوکت علی کا تخلص

۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان بزم اردو شملہ کے زیر اہتمام چار پانچ بہت بڑے مشاعرے ہوتے۔ بہت بڑے اس لئے کہا کہ منتظمین کی سنجیدہ مزاجی ابھی "آل انڈیا" کے مرض میں گرفتار نہیں ہوئی تھی۔ انھیں مشاعروں میں سے ایک مشاعرے کا ذکر ہے۔ مولانا شوکت علی مرحوم اسٹیج پر ایک نابینا شاعر کو لائے اور حاضرین سے درخواست کی کہ یہ ان کے وطن رام پور کے امّی شاعر ہیں ان کا کلام صرف اس لئے سن لیا جائے کہ ان کا پڑھنے کا اشتیاق انھیں یہاں

تک کھینچ لایا ہے۔ مولانا نے اس موقعے کو غنیمت جانا اور اپنی اور اپنے خاندان کی شعر پرستی کا ذکر بھی فرما دیا۔ کہنے لگے "ہمارے بڑے بھائی مولانا ذوالفقار علی گوہر مرزا داغ کے شاگرد اور ایک نامور شاعر ہیں۔ چھوٹے بھائی مولانا محمد علی جوہر سے کون واقف نہیں اور میں . . . کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ معاً حاضرین میں سے کسی نے اونچی آواز میں کہا "شوہر"۔ اللہ تیری شان۔ کتنا اچھا تخلص عطا ہوا مولانا کو۔ اور وہ بھی گوہر اور جوہر کا ہم قافیہ۔ قہقہے پر قہقہہ بلند ہوا۔ تالیوں کے شور سے ہال گونج اٹھا۔ مولانا نے ایک زمانہ دیکھا تھا۔ بڑے جہاندیدہ اور مجلسی آدمی تھے۔ محفل کی نبض پہچان گئے اور اس حسنِ مذاق کی خود بھی داد دینے لگے۔ بس پھر تو فرمائشی تالیاں بجنے لگیں اور قہقہوں کی گونج ہال کی چھت سے گزر کر شملے کی پہاڑیوں سے ٹکرانے لگی۔

بزرگ اور عاشقی

اس بزم کے ایک مشاعرے کا ذکر ہے۔ ایک مقتدر بزرگ[۱] صدرِ مشاعرہ تھے۔ انھوں نے بڑی عمر میں عشق کیا تھا اور اس کا نتیجہ ایک شادی تھا جس کا اخباروں میں بہت چرچا ہوا تھا۔ صاحب صدر برہنہ سر تھے۔ سفید بال ان کی پیرانہ سالی کے مظہر تھے۔ مشاعرہ خلاف معمول طرحی تھا اور اقبال کا مشہور مصرع "نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے" مصرع طرح تھا۔ ایک

---

[۱] سر رضا علی مرحوم۔ جب یہ مضمون لکھا گیا تھا مرحوم بقید حیات تھے اس لیے مصلحتاً نام نہیں لکھا گیا تھا۔

پرانے عمر رسیدہ شاعر طرحی غزل پڑھنے کے لئے اٹھے ۔ چند شعروں کے بعد شعر پڑھا

یہ کل کے چھوکرے عاشق مزاج بنتے ہیں
کسی بزرگ سے پوچھیں کہ عاشقی کیا ہے

جب بزرگ کا لفظ آیا تو شاعر کا ہاتھ بغیر کسی قصد کے صاحب صدر کی طرف اشارہ کر رہا تھا ۔ سننے والے لے اُڑے ۔ نہ جانے کتنی بار یہ شعر پڑھوایا گیا ۔ صاحبِ صدر جو خود ایک بذلہ سنج اور صاحبِ ذوق شخص ہیں ۔ شعر کی داد دئے بغیر نہ رہ سکے ۔ سچ پوچھئے تو حسنِ مذاق کا تقاضا بھی یہی تھا ۔

شانِ سکندری

اس مشاعرے میں سر سکندر مرحوم بھی تشریف فرما تھے (یونینسٹ ان دنوں پنجاب میں برسرِ اقتدار تھے اور مرحوم ۱۹۳۵ء کے دستورِ اساسی کے تحت پہلے وزیر اعظم تھے) راقم کے اس شعر کی خود انھوں نے بھی بہت داد دی تھی ۔

دو روزہ عظمت و شوکت پہ پھولنے والے
اجل سے پوچھ کہ شانِ سکندری کیا ہے

خدا گواہ کہ یہ شعر کہتے وقت مجھے اس کا ذرا بھی احساس نہ تھا کہ سر سکندر اتنی چھوٹی عمر پائیں گے ۔ یہ نکتہ تو مجھے کسی دوست نے کئی سال بعد سمجھایا کہ "عظمت" اور "شوکت" ان کے فرزندوں کے نام ہیں ۔ شعر کا مضمون تو عام تھا لیکن مشاعرے میں سر سکندر کی موجودگی شعر کو لے اُڑی ۔ تالیوں کا شور اٹھا قہقہے بلند ہوئے ۔ سیاسی مصلحتوں کے تحت شعر کو کئی بار پڑھنے کی فرمائشیں بھی ہوئیں ۔ لیکن مجھے اس وقت بھی یقین تھا اور اب بھی یقین ہے کہ

شعر کا مضمون عام ہے اور اس شعر کا سکندر وہی سکندر ہے۔ جو ایک روایت کے مطابق خضر کے ساتھ آبِ حیات پینے گیا تھا۔

قارون کا خزانہ

علی گڑھ کے ایک مشاعرے میں مصرع طرح تھا۔ ع

قارون نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

کاندھلے سے کچھ شاعر حضرات اس مشاعرے میں شامل ہوئے۔ اتفاق کی بات ہے کہ یہ سب حضرات گنجے تھے۔ مصرع طرح پر گرہ لگانے کا رواج عام تھا۔ لیکن مصرع بچارا رنڈوا ہی رہا۔ کسی سے کام کی گرہ نہ لگ سکی۔ آخر میں ایک صاحب تشریف لائے اور وہ چست گرہ لگائی کہ مشاعرہ زیروزبر ہو گیا۔

آتا ہے کاندھلے سے جو لاتا ہے ساتھ گنج

قارون نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

نمک حرامانِ غزل

شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی غزل کو غیر فطری صنفِ سخن قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک دن اس موضوع پر حکیم آزاد انصاری مرحوم سے دیر تک بحث جاری رہی۔ جوش صاحب کا بڑا اعتراض یہ تھا کہ چونکہ غزل کا ہر شعر موضوع کے اعتبار سے انفرادی حیثیت رکھتا ہے اس لئے خیال قوافی کے تابع ہو جاتا ہے اور قوافی خیال کے تابع نہیں رہتے۔ بیمار کر دیا کے بعد ہشیار کر دیا یا انکار کر دیا کے بعد اقرار کر دیا۔ شعر کا ضروری جزو ہو گا تو اس لعنت سے مفر ہی نہیں کہ خیال الفاظ کے پیچھے پیچھے چلے۔ حکیم آزاد انصاری خدا بخشے بڑے زندہ دل اور بذلہ سنج انسان

تھے فوراً ایک رباعی چست فرمائی اور جوش صاحب کو سنائی۔

کہتے ہو کہ پچتی نہیں اب شانِ غزل — ممکن ہو تو ڈھا دیجئے ایوانِ غزل

سرکارِ غزل میں پل کے غزلوں سے یہ تیر — افسوس ہے اے نمک حرامانِ غزل

تیسرا مصرعہ پُر معنی تھا۔ ع سرکارِ غزل میں پل کے غزلوں سے یہ بیر۔ اس وقت تو خیر میدان رباعی کے ہاتھ رہا۔ دوسرے دن جوش صاحب حکیم صاحب سے ملے تو فرمانے لگے "حکیم صاحب تاج محل بھی شاہ جہانی دور کا ایک شاہ کار ہے۔ سالن میں آج نمک زیادہ تھا۔ برسات کب آئے گی۔ جوتی کی کیل پیر میں چبھ گئی۔ سیب کیا بھاؤ بکتے ہیں"۔ حکیم صاحب بہت جھنجھلائے اور کہنے لگے "یہ کیا بے تکی باتیں کر رہے ہو۔ حواس تو قائم ہیں"۔ جوش صاحب نے فرمایا "حکیم صاحب سمجھے نہیں آپ میں 'غزل' فرما رہا ہوں" ایک فرمائشی قہقہہ بلند ہوا اور حکیم صاحب کچھ جواب نہ دے سکے۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

لطیفۂ جلی

مولانا عبد المجید سالک ابھی جوان تھے "یہ باتیں ہیں جب کی کہ سالک جوان تھا" لاہور کے ایک مشاعرے میں سامعین کی صف میں تشریف رکھتے تھے۔ ساتھ ایک سخن شناس دوست بھی تھے۔ شعراء کے کلام پر آپس میں نقد و تبصرہ جاری تھا۔ قریب ہی ایک اور نوجوان بیٹھے تھے۔ غالباً "شعر فہمی عالم بالا معلوم شد" جماعت کے رکن تھے۔ سالک صاحب نے شعر کی داد دیتے ہوئے آہستگی سے اپنے دوست کو مخاطب کر کے کہا۔ "کیا خوب مصرعہ ہے" ردیف بول رہی ہے"۔ اس

نوجوان نے بلند آواز سے شاعر کو مخاطب کر کے یہی لفظ دُہرا دیے ۔ داد دینے کے اس شوقِ بے جا میں لپک لپک کر اٹھنے اور سالک صاحب کے رسمی الفاظ جو وہ اپنے دوست سے کہتے مشاعرے میں دُہرا دیتے ۔ عجب عالم تھا مشاعرے کا۔ آدھا لطف تو ان حضرات کی حرکتوں سے جاتا رہا ۔ سالک صاحب بہت کبیدہ خاطر ہوئے معاً ایک ترکیب سوجھی ۔ ایک بزرگ شاعر غزل فرما رہے تھے ۔ چوتھا پانچواں شعر تھا ۔ سالک صاحب نے اپنے دوست سے کہا "کیا ایطائے جلی ہے" ۔ وہ نوجوان بھی اُٹھا اور اس نے بلند آواز سے داد دی "کیا ایطائے جلی ہے" ۔ اس کی بلا جانے کہ یہ کس عیب کا نام ہے ۔ استاد قسم کے پُرانے شاعر پر ایطائے جلی کا الزام گویا قتلِ عمد کا الزام تھا ۔ وہ تو زخمی شیر کی طرح گرجے "واہ رے صاحب زادے کیا ہونا ہے ایطائے جلی" ۔ غزل کے پانچویں شعر میں ایطائے جلی نظر آ گیا تمہیں ۔ ہماں ہوش میں آؤ مطلع تو کبھی کا ہو چکا تمہیں تو غالباً خفی کا بھی پتہ نہیں یہ ایطائے جلی کہاں سے سُن لیا تھا ۔ توبہ توبہ کیسے کیسے جاہلوں سے واسطہ پڑتا ہے" منتظمین نے شاعر کو ٹھنڈا کیا اور حاضرین نے اس نوجوان کی خوب خبر لی ۔ اب تو وہ حضرت زیادہ دیر مشاعرے میں نہ بیٹھ سکے ۔ ذرا موقع ملا تو چپکے سے چل دیے لیکن جاتے جاتے سالک صاحب سے مخاطب ہو کر اتنا ضرور کہہ گئے ۔ "ہوں ! ایطائے جلی" ۔

ارمان کی مونچھیں ۔

منشی راج نرائن ارمان دہلوی بڑی خوبیوں کے انسان تھے ۔ اپنے نام کے ساتھ طوطیٔ ہند، کھٹ شاستری، منجم، جفار اور جانشین فصیح الملک مرزا داغ بھی لکھا کرتے تھے ۔ سنگلاخ زمینوں میں غزلیں کہتے اور مشاعروں کی صدارت

کا خاص شوق رکھتے تھے ۔ گول چہرہ، بڑی بڑی مونچھیں اور بھرا ہوا جسم کرسی صدارت پر عجب متانت سے بیٹھتے ۔ فخریہ انداز میں شعر پڑھتے اور داد کے طالب ہوتے ۔ لاہور میں کسی کالج کے مشاعرے کی صدارت فرما رہے تھے ۔ غزل پڑھنے کو اٹھے تو خاموشی کا عالم تھا ۔ غزل کی زمین تھی ۔ دلدار کی آنکھیں بیمار کی آنکھیں، شعر پڑھتے تو "کی" پر رک جاتے اور "آنکھیں" سامعین کے لیے چھوڑ دیتے ۔ ایک شعر پڑھا جو نہی انہوں نے "دلدار کی" کہا اور رکے، سامعین میں سے ایک نوجوان اٹھا اور اٹھ کے بولا "مونچھیں" ۔ ارمان صاحب نے کہا نہیں آنکھیں ۔ وہ پھر بولا نہیں مونچھیں ۔ دونوں میں ایک جنگ چھڑ گئی ۔ وہ کہہ رہے تھے نہیں آنکھیں اور وہ کہے جا رہا تھا نہیں مونچھیں ۔ چاروں طرف ایک شور برپا ہو گیا ۔ نہیں مونچھیں، نہیں مونچھیں کی آوازیں بلند ہوئیں ۔ مشاعرہ درہم برہم ہو گیا ۔ اور یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ شعر آنکھوں پر ختم ہوتا ہے یا مونچھوں پر ۔ دوسرے دن اخبارات میں اس واقعے کا ذکر ہوا ۔ یار لوگوں کو شگوفہ مل گیا ۔ ایک نظم انسان کی مونچھیں، شیطان کی مونچھیں بھی شائع ہوئی ۔ اس میں ارمان کا قافیہ بھی تھا اور ایک مصرع تو ہمیں اب تک یاد ہے ۔ ع

راون کے لبوں پر ہیں ہنومان کی مونچھیں

مصرع فصیح ہو نہ ہو دلچسپ ضرور ہے ۔

دفتر کی طیّاری

آدمی کی بدحواسیوں کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ کم و بیش ہر شخص بدحواسی کا مظاہرہ کرتا ہے چنانچہ اکثر بڑی دلچسپ باتیں اس باب میں سُنی جاتی ہیں۔ ٹانگہ خالی ہے کی جگہ' خالہ ٹانگی ہے۔ فرمایا بجا ہے کی جگہ بجانا فرما ہے کہنے میں آتا ہے۔ صرف اسی پر موقوف نہیں بعض اوقات بہت ہی مضحکہ خیز واقعات دیکھنے میں آتے ہیں۔ ایسے ہی ایک واقعے کا ذکر ہے۔ چار مسافر اسٹیشن پر پہنچے تو گاڑی نے وسل دے دی۔ ٹکٹ خریدے جا چکے تھے اس کے باوجود چاروں مسافروں کی بدحواسی کا یہ عالم تھا کہ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر باقاعدہ دوڑ شروع ہو گئی گاڑی چل دی۔ دو تو سوار ہو گئے اور دو رہ گئے۔ خفّت کے مارے سر جھکائے یہ دونوں واپس آ رہے تھے۔ ایک قلی نے اظہار افسوس کیا اور کہا کہ آپ نے محنت تو بہت کی لیکن سوار نہ ہو سکے۔ انہوں نے جواب میں کہا افسوس اس کا نہیں کہ ہم رہ گئے بلکہ افسوس اس بات کا ہے کہ جو سوار ہو گئے وہ ہمیں پہنچانے آئے تھے۔ جانا ہمیں تھا اور چلے وہ گئے۔ مطلب اس کہانی کا صرف یہی ہے کہ بدحواسی کے عالم میں آدمی ایسی مضحکہ خیز باتیں کر بیٹھتا ہے کہ بے اختیار ہنسی آتی

ہے۔ دفتر کو جانتے ہوئے بھی آدمی اکثر ایسی بدحواسیوں کا شکار ہوتا ہے۔ یوں تو دفتر کی زندگی میں کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوگا کہ آدمی کا خون خشک نہ ہوتا ہو ہر وقت کوئی نہ کوئی تشویش دامن گیر رہتی ہے۔ نالائق ماتحتوں کا رونا۔ بے سمجھ افسروں کی شکایت اپنی قابلیت کی ناقدری کا ذکر خیر۔ الغرض ہزاروں باتیں دفتر اور دفتر کی زندگی سے متعلق حق وناحق کی جاتی ہیں۔ لیکن ان سب سے صبر آزما وہ لمحات ہیں جو گھر پر دفتر کی طیاری میں گزرتے ہیں۔

صبح اٹھتے ہی دفتر کا خوفناک تصور ذہن پر چھا جاتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ رات کو بھی یہ تصور پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اکثر اصحاب کو خواب میں دفتر کی رٹ لگاتے سنا ہے۔ سوتے میں بڑبڑاتے ہیں تو کسی فائل پر بحث کرتے چپراسی کو جھڑکیاں دیتے یا کسی ساتھی کے ساتھ جھگڑے کا ذکر فرماتے ہیں۔ گویا دفتر کا تصور اس قدر ذہن پر سوار رہتا ہے کہ خواب میں بھی اس سے بھاگنے کا امکان نہیں۔ جب صبح کی سیر کو جاتے ہیں تو صبح کے مناظر ہری ہری گھاس پھولوں کی مہک، باغ اور باغ کی روشیں سب پر دفتر کا سائن بورڈ نظر آتا ہے آزادی سے کسی چیز کا لطف ہی نہیں اٹھایا جا سکتا کسی نے کوئی دلچسپ موضوع چھیڑا تو بات بیچ ہی میں کاٹ دی اور فرما دیا۔ "اجی صاحب چھوڑیئے دفتر بھی پہنچنا ہے ابھی کتنے کام باقی ہیں، حجامت بنانا ہے نہانا ہے، کھانا کھانا ہے۔ بچے اور بیوی کی دوائی بھی حکیم جی سے لانی ہے۔ اس پر یہ حال ہے کہ ہیڈ کلرک صاحب پانچ منٹ کی بھی مہلت نہیں دیتے۔ ایک منٹ کی بھی دیر ہوتی تو جواب طلبی اور زیادہ ہو جائے تو پھر پیشی۔ کیا کریں یہ کل کے چھوکرے افسر بن گئے

اور ہم سے دس دس سال جونیئر گریڈ کے آدمی ہیڈ کلرک بن گئے" چنانچہ اس قسم کی گفتگو میں وقت ضائع کرتے ہیں دوسرے کی بات سننے کا وقت نہیں ہوتا۔

گھر پہنچتے ہیں تو عجب عالم ہوتا ہے۔ ایک طرف حجامت بن رہی ہے۔ دوسری طرف بچّے کو پڑھا رہے ہیں۔ بیوی سے کھانا جلد پکانے کے لیئے بار بار تقاضے ان سب پر مستزاد۔ اچھی بھلی کام کرتی ہو تو اسے بدحواس بنا دیتے ہیں۔ کوئلے سلگنے میں نہیں آتے۔ چولھے پر غصہ گیلے کوئلوں کو گالیاں۔ دکاندار۔ کنٹرول جنگ ہٹلر اور نہ جانے کون کون اس وقت عتاب کا شکار ہوتا ہے۔ بے توجہی کے عالم میں اُسترے کا زخم کھا بیٹھے خون بند نہیں ہوتا۔ پھر پھٹکڑی کی تلاش میں گھر کے گھر کو اُلٹ پلٹ دیتے ہیں دفتر کی تیاری ایک اچھی خاصی مہم کی تیاری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اتنے میں بچے پر بھی نزلہ گرتا ہے۔ تعلیم کے اصول اور بچے کی نفسیات سے تو واقف نہیں ہوتے۔ اسے جو سمجھاتے ہیں اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ بچے کی سوجھ بوجھ کے مطابق بات سمجھانا نہیں جانتے۔ آخر دو چار تھپڑ سے اپنی کم سمجھی کا علاج کرتے ہیں اور بچّے کو بھی بدحواس بنا کر سارا گھر سر پہ اٹھا لیتے ہیں۔

"آج مجھے جلد دفتر جانا تھا ایک نہایت ضروری کیس تیار کرنا تھا سو بار یہ بات سمجھا چکا ہوں کہ میرے بغیر دفتر کا کام چل نہیں سکتا۔ وہاں سب کے سب بدھو ہیں۔ ایک میری ذات نہ ہو تو گورنمنٹ کے سب کام رُک جائیں۔ اب کیسے پہنچوں گا"۔ بیوی کے سامنے یہ تقریر جھاڑ کر غسل خانے کا رخ کرتے ہیں۔ بدحواس تو ہو ہی چکے ہیں کبھی تولیا باہر چھوڑ گئے۔ صابن موجود ہے تیل

نہیں اور تیل ہے تو صابن نہیں - کپڑے بدلنے کا خیال بھی تھا - پھر باہر آتے اور ساون کے گرجتے ہوئے بادل کی طرح برسے - بیچاری رسوئی چھوڑ کر کپڑے نکالنے لگیں تو ہر قمیص اور پاجامے کو رد فرما رہے ہیں - یہ نہیں وہ نہیں - اس کے ساتھ کا پاجامہ کہاں گیا - اس کے ساتھ کی قمیص کہاں گئی - وہ پینٹ جو پچھلے سال سلائی تھی کبھی پہننے میں نہیں آئی - بارے خود بھی ٹرنک کے سب کپڑے نکال کر باہر پھینک دئے اور جو جی میں آیا لے کر غسل خانے میں داخل ہو گئے - نہا کر باہر نکلے تو پھر وہی غیظ و غضب کا عالم - قمیص کے ایک دو بٹن نہیں ہیں - بٹن جلد لگاؤ - کوئی کام بھی تو یہاں سلیقے سے نہیں ہوتا - کہیں دفتر کی ملازمت کرنی پڑتی تو دوسرے دن ڈسمس ہو جاتیں - یہ ہمارا ہی حوصلہ ہے کہ نباہ کر رہے ہیں ورنہ ان نالائقیوں پر بیوی کیا آدمی نوکر کو نہیں رکھ سکتا - ہندوستانی معاشرت میں پلی ہوئی ہندوستانی بیوی کے تصور میں خاوند خدا کا درجہ رکھتا ہے - ورنہ ان حماقتوں کو کون دیکھ سکتا ہے بیچاری چپکے چپکے سن لیتی ہے اور دعا کرتی ہے کہ آج کا دن خیر سے گزر جائے - دفتر جائیں تو سب چیزوں کو ان کی جگہ پر پھر ترتیب سے رکھ دوں گی نہیں دیر نہ ہو جائے اور وہ کیس جو انہیں تیار کرنا ہے - ان کے سوا کوئی اور تیار بھی نہیں کر سکتا - کہیں ایسے کا ایسا ہی رہ نہ جائے - ان کی دل جمعی کے لئے خود کڑوے گھونٹ پی لیتی ہے اور کوئی میٹھی بات کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن یہاں تو دفتر کا ہوّا سر پر سوار ہے اور پیش از مرگ واویلا کے مصداق میاں کسی کی سنتے ہی نہیں - ہمسائے سمجھتے ہیں بیوی خاوند میں جھگڑا ہو رہا ہے - بچے سہمے ہوئے روز کے ڈرامے کا سین دیکھ کر باہر بھاگ جاتے ہیں اور والد ماجد کی

بدحواسی پر بے اعتنائی کی ضرب لگاتے ہیں۔ کپڑے پہنتے ہیں تو چیخنے چلّانے تو منہ میں آئے بک جاتے ہیں۔ پاجامہ گلے میں ڈالنے اور قمیض میں ٹانگیں لٹکاتے اکثر دیکھے گئے ہیں۔ اُلٹا پاجامہ پہنے کبھی گھر سے نکل گئے ہیں۔ اور دُور سے پلٹ کر آتے ہیں۔ اُدھڑا ہوا پاجامہ پہنے کبھی دفتر بھی پہنچ گئے ہیں۔ کھانا کھانے بیٹھتے ہیں تو گھڑی سامنے رکھ لیتے ہیں۔ منٹ منٹ کا حساب ہو رہا ہے۔ لیکن مزاج کو کیا کریں وہ تو اتنا بگڑ چکا ہے کہ کوئی سبزی لذیذ نہیں۔ آٹے میں مٹی ہے روٹی چبائی نہیں جاتی۔ کسی سبزی میں نمک کم کسی میں زیادہ۔ برابر کا کسی میں نہیں دہی ہے تو نہیں چاہیے اور نہیں ہے تو بار بار مانگتے ہیں۔ دو چار لقمے کھانے کے بعد تھالی کو زمین پر ٹیک دیتے ہیں۔ بیوی کے فرائض کھانا تیار کرنے میں بیوی کی نا اہلیت، زمانے کی بے راہ روی، عورت کی حقوق طلبی، ہندو کوڈ بل اور نہ جانے کن کن موضوعات پر ایک لمبی چوڑی تقریر گرجتے برستے فرما دیتے ہیں خدا بھلا کرے ان بیوی صاحبہ کا کہ روز کا معمول سمجھ کر خاموش رہتی ہیں۔ میاں کا قصور نہیں سمجھتیں۔ دفتر میں کام کی زیادتی اور میاں کے ساتھیوں کی نالائقی پر ان تمام باتوں کی ذمہ داری عائد کرتی ہیں۔ خدا خدا کر کے گھر سے نکلنے کا وقت آتا ہے۔ سائیکل کو ہاتھ لگایا تو پہیوں میں ہوا نہیں۔ پمپ کبھی گھر میں رکھا نہیں جلدی سے سائیکل کی دکان پر گئے ہوا بھروائی اور چلے دفتر کی طرف بڑی تمکنت کے ساتھ۔ جیب ٹٹولی تو شناخت کا کارڈ نہیں۔ آدھا رستہ طے کر کے پھر پلٹے کبھی کبھی دفتر میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ چابیاں گھر پر رہ گئی ہیں۔ چپراسی کو دوڑایا تو چابیاں منگوائیں۔ کوئی ضروری کاغذ گھر پر رہ جائے تو خود بھی گھر پلٹنا پڑتا ہے

یہ تو روز کا معمول ہے اور اس معمول میں زندگی جسے دلچسپ اور پُر سکون بنانے کے لئے دفتر کی ملازمت اختیار کی ہے۔ کتنے کتنے بے سکونی میں کٹ جاتی ہے غیر معمولی باتوں کا ذکر کیا جائے تو یہ داستان اور بھی طولانی ہو جائے۔ بسا اوقات عین وقت پر کوئی مہمان تشریف لے آتے ہیں۔ ادھر حواس اڑ رہے ہیں۔ ساڑھے نو۔ پونے دس اور اس کے بعد جو منٹ بھی گزرتا ہے دل پر ایک تیر چلا جاتا ہے چھوٹی وضعداری ہماری معاشرت کا ایک ضروری جزو ہے۔ بیوی سے جھگڑا ہو سکتا ہے۔ بچے پٹ سکتے ہیں لیکن مہمان اور بالخصوص بن بلائے مہمان سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت اب دفتر کا وقت ہے۔ مجھے جانے دیجئے۔ شام کو ملاقات ہو گی۔ اب اگر لیٹ ہو گئے تو دفتر میں جواب دینا پڑے گا۔ افسر ناخوش ہیں اور ناخوش ہو جائیں گے۔ لیکن ایسا کہیں تو اپنے وقار پر بھی ضرب لگتی ہے۔ مہمان اگر کہے بھی کہ آپ کا وقت ہو رہا ہو گا تو فرما دیتے ہیں نہیں کوئی بات نہیں۔ ہمیں پوچھنے والا ہی کون ہے۔ ہم خود ہی تو "مالکِ کُل" ٹھہرے۔ آپ بے تکلفی سے باتیں کیجئے۔ ذرا اور دس منٹ ٹھہر کر چلے جائیں گے۔ وقت کی پابندی ہم پر فرض نہیں اور پھر اوقات دفتر کے بعد بھی تو گھنٹوں کام کرتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ مہمان صاحب بے چارے کیا جانیں کہ یہ باتیں محض "تکلّف" ہیں اور حقیقت اس کے برعکس ہے۔ وہ بھی جم جاتے ہیں۔ ایسے عالم میں کئی بار گھنٹہ دو گھنٹہ لیٹ پہنچے تو بھیگی بلی بن کر کمرے میں داخل ہوئے۔ رونی صورت اور اُداس چہرہ لئے حاضری کا رجسٹر اٹھایا۔ پوچھنے والے تو چوکتے ہی نہیں۔ لیٹ آنے کا سبب پوچھا گیا تو بیوی کی بیماری کا بہانہ بنایا گیا۔ گویا بیوی ہر مصیبت کا علاج اور

ہر مشکل میں مشکل کشا ہے ۔ سودا سلف لینے کے لئے بازار جانا' ڈاکٹر سے کسی بیمار کے لئے دوائی لانا' اسٹیشن تک کسی کو پہنچانے جانا خط لکھنا اور اس قسم کے دوسرے کام بھی گاہ گاہ دفتر جانے سے پہلے کرنے پڑتے ہیں ۔ جس روز اس قسم کا کوئی کام درپیش ہو اس روز تو گھر میں قیامت آجاتی ہے اور بازار میں حادثے کا امکان ہوتا ہے ۔ ڈاکٹر کے جائیں گے تو دوسرے مریضوں سے لڑائی مول لیں گے "اجی صاحب ٹھہریئے ذرا ہمیں دفتر جانا ہے" ۔ بس اتنا کہا اور بحث شروع ہو گئی ۔ اپنی اپنی فوقیت جتلائی جا رہی ہے اور وہی وقت جسے بچانے کی کوشش میں ہیں ضائع کیا جا رہا ہے ۔ سودا لینے جائیں گے تو دکاندار سے جھگڑا کریں گے اگر خدانخواستہ طبیعت قابو میں رہی اور مزاج کا پارہ نہ چڑھا تو گھر آتے ہی بیوی پوچھ بیٹھے گی کہ کس بھاؤ لائے ۔ بھاؤ بتانے پر ایک تنقید سننی پڑے گی ۔ کہ اس سے سستا تو ہمارے ہمسائے ابھی کل لائے ہیں ۔ گلی میں پھیری والا اس سے سستا بیچ رہا تھا ہم نے خریدا نہیں اس قسم کی تنقید یوں تو ہمیشہ بیوی خاوند کے جھگڑے کا باعث ہوتی ہے لیکن دفتر کی طیاری کے اوقات میں تو اسے "جنگ عظیم" کا نسخہ سمجھئے ۔ ہونہ ہو ایک دھما چوکڑی مچے گی ۔ شور اٹھے گا ۔ گالی اور جہاں اخلاق کا قطعی نشان نہیں ڈھول دھپے تک بھی نوبت پہنچے گی ۔

خط لکھنے بیٹھیں گے تو چلا چلا کے سو بار پوچھیں گے "گھر خط لکھ رہا ہوں کچھ لکھوانا تو نہیں ۔ خط لکھنے جائیں گے اور کہتے جائیں گے سو بار کہا ہے کہ ایسے خط خود لکھ دیا کرو ۔ ہمیں فرصت ہی کب ملتی ہے ۔ یہ تو محض عام قسم کے خط ہیں کوئی خاص خط لکھنا ہو تو ہمیں تکلیف دینا چاہئے ۔ دفتر کا وقت

ہو رہا ہے اور یہاں دہی تقاضے کہ گھر سے خط آئے ایک مہینہ ہو گیا جواب تک
نہیں دیا۔ القصہ دفتر کی طیاری کا حال ایک دلچسپ داستان ہے۔ اس وقت
سب سے زیادہ مصیبت بیوی پر نازل ہوتی ہے یا جو اس بلا سے محفوظ ہیں اور
عرف عام میں کنوارے یا رنڈوے ہیں نوکروں کے لیئے ایک مصیبت بن جاتے
ہیں۔ جو آزاد محض ہیں اور نوکر رکھنے کی ہمت نہیں رکھتے ہمت کہیئے یا استطاعت
ان بے چاروں کے لیئے یہ لمحات اپنی ہی ذات پر بجلی کی طرح گرتے ہیں کھانا بنانے
کی فکر یا ہوٹل کو بھاگنے کا خیال صبح کے دو تین گھنٹے تانا بانا تننے میں گزر جاتے
ہیں۔ ہم نے ہزار جستجو کی کہ کوئی ایسے صاحب مل جائیں جو ان لمحات کو رحمت
سمجھتے ہوں۔ اور ان لمحات میں حواس قائم رکھنے میں کامیاب ہوتے ہوں مگر
آج تک کوئی نہیں ملا۔ جس کو دیکھو یہی کہتا نظر آتا ہے کہ اپنی اولاد کو دفتر کی
ملازمت کے بھاڑ میں نہیں جھونکیں گے۔ بس چلا تو اسے آزاد بنائیں گے۔ کوئی
ایسا کام کروائیں گے۔ لیکن بیچارے کیا جانیں کہ آخر اسی چکر میں انہیں بھی
گرفتار ہونا ہوگا۔ ایسے گھر بھی ہیں جہاں بابو صاحب کے والد صاحب اور
فرزندان ارجمند بھی دفتر میں ملازم ہوتے ہیں اور یہ بیک وقت گھر میں چار
پانچ قسم کے طوفانی مزاج اس طریق سے کار فرما ہوتے ہیں جیسے سمندر میں
جوار بھاٹا۔ اچھے گھروں میں بیویاں بھی دعا کیا کرتی ہیں "کاش ہم بابو
ہوتیں اور بابو ہماری بیویاں"۔

عادت سے مجبور

"باتونی"

سب جانتے ہیں کہ بچّہ پیدا ہوتے ہی بولنا شروع نہیں کر دیتا۔ وہ جوں جوں بڑھتا جاتا ہے، گرد و پیش کے ماحول سے متاثر ہو کر اس کی زبان کھلتی جاتی ہے اور اس طرح غیر شعوری طور پر اسے بولنا آ جاتا ہے۔ علم النفس کے جاننے والوں نے عام طور پر اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ خیال کو زبان کے مقابلے میں پہل حاصل ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ذہنِ انسانی میں جس طریق سے خیال کی نشو و نما ہوتی ہے زبان بھی اسی طریق سے ارتقائی منزلیں طے کرتی ہے۔ قدرت نے اس کی ترقی یافتہ جسمانی اور دماغی ساخت کو اظہارِ خیال کے وہ ذرائع دئے ہیں جن تک جانوروں کی رسائی نہیں۔ لیکن انسان معاشرتی اور سماجی زندگی سے الگ نہیں ہو سکتا اور اس سے وابستگی ظاہر کرنے کے لئے بھی زبان کا استعمال کرتا ہے۔ اگر اس کا یہ اقدام شوق اور عادت کی حد تک پہنچ جائے بلکہ شوق اور عادت سے تجاوز کر کے طبیعتِ ثانیہ بن جائے تو یہ ایک عیب بن جاتا ہے۔ محض اس کے اپنے لئے ہی نہیں بلکہ سننے والوں کے لئے بھی۔ انسان بھی ایک جانور ہے اسی لئے تو اسے حیوانِ ناطق

کا نام ملا ہے۔ لیکن جانوروں کی اس نسل میں کچھ ایسے جانور بھی ہیں جو محض ناطق ہی نہیں بلکہ "ناطق تر" ہیں۔ موقع ہو نہ ہو، محل ہو نہ ہو لیکن عادت سے مجبور ہو کر اپنی ہانکتے چلے جائیں گے۔ کوئی سنے نہ سنے وہ بات کئے جائیں گے۔ اس قسم کے باتونی حضرات عادت کے غلام ہوتے ہیں قصور ان کا نہیں اُن کے اس جوشِ بے اختیار کا ہے جو نطق اور گویائی کی شکل اختیار کر کے سننے والے کے لئے بارِ گوش ہو جاتا ہے۔

عادت سے مجبور لوگوں کی بہت سی قسمیں ہیں چغل خور، گپّی اور باتونی وغیرہ عادت سے مجبور ہو کر اپنی اپنی دُھن میں اپنے قول اور فعل کی جاذبیت یا افادیت سے قطع نظر سوسائٹی کے کسی نہ کسی پہلو پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں ان کی ایسی ہی اور بہت سی قسمیں بھی ہیں جن کا ذکر بجائے خود دلچسپی سے خالی نہیں لیکن ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ربط یا اختلاط بجائے دلچسپی کے ایک قسم کا بار ثابت ہوتا ہے ہر شخص کسی نہ کسی اچھی یا بُری عادت میں گرفتار ہوتا ہے۔ اچھی یا بُری محض اضافی لفظ ہیں اس لئے یہ فیصلہ کرنا کہ ان لوگوں میں سے کس کو اچھا کہا جائے یا کس کو بُرا کوئی آسان بات نہیں۔ ہمیں اس مختصر سے وقت میں محض باتونی کی باتوں کا جائزہ لینا ہے۔ یہ دیکھنا ہے کہ اس کی باتیں کہاں تک دلچسپ ہوتی ہیں ان میں افادیت کا عنصر کہاں تک ہوتا ہے۔ ہمیں ان کو سنجیدہ جان کر انہیں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے یا غیر سنجیدہ سمجھ کر یونہی چھوڑ دینا چاہیئے۔

اگر ہم عادت کے نفسیات پر ذرا غور کریں تو ہم پر واضح ہو جائے گا کہ عادت کے تحت جو افعال سرزد ہوتے ہیں اُن میں ارادے یا نیت کو پورا دخل نہیں

ہوتا۔ بہت سے کام یا بہت سی باتیں غیر ارادی طور پر بھی ہوتی ہیں۔ باتیں کرنے کا شوق بھی انسان کی اسی انانیت کا ایک جزو ہے جس کے تحت وہ اپنی فوقیت کو دوسروں پر ثابت کرنے کے لیئے سرگرم عمل رہتا ہے۔ کسی عمل کو اخلاق کی کسوٹی پر پرکھنے کے لیئے زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ عمل کرنے والے کا ارادہ کیا تھا نیت کیا تھی۔ بات کرنے سے پہلے باتونی کے نفس میں متضاد فطری رجحانات کی ایک جنگ ہوتی ہے۔ اغراض اور مقاصد کچھ اور چاہتے ہیں۔ عادت کی مجبوری کا تقاضا کچھ اور ہوتا ہے۔ اغراض اور عادت کے اس تصادم میں عادت کو فتح حاصل ہوتی ہے ارادوں اور ترغیبات کی اس خانہ جنگی میں وہی ترغیبات غالب آتی ہیں جن کی محرک طبیعت ثانیہ ہوتی ہے۔ اس لئے محض ظاہری نظر سے "باتونی" کو سوسائٹی کا عضوِ ضعیف یا عضوِ ناقص سمجھ کر اس سے نفرت نہیں کرنی چاہیئے۔ ہم حق بجانب ہو سکتے ہیں اگر اس نفرت میں ہماری اپنی عادت کی تحریک نہ ہو۔ آخر ایسی غیر ضروری چیزوں اور بے محل باتوں سے نفرت کرنا بھی تو ایک عادت ہے۔

آیئے اب اپنے موضوع خاص سے بالمشافہ تعارف کا بھی شرف حاصل کریں۔ ماں باپ کا رکھا ہوا نام کسی کو معلوم نہیں۔ عام لوگوں میں "جناب باتونی" کے خاص نام سے مشہور ہیں۔ خاندانی لقب کی ضرورت ہی نہیں۔ علم و فضل والوں نے انہیں بہت سے خطاب بھی دیئے ہیں جن میں سے متین الملک حضرت خواجہ یاوہ گو صاحب، نواب قاطع الوقت بہادر اور مرزا ہرزہ بخت، خاص طور پر مشہور ہیں۔ گلی محلّے کے لونڈے انہیں "مرغِ بے ہنگام" کہتے ہیں۔ اکہرا بدن، چلتے ہوئے عضو، بلا کے پھرتیلے، ادھیڑ عمر کے انسان ہیں، ناک کان وغیرہ وہی عام انسانوں جیسے، زبان لوچ سے خالی ہے تو اتنی ہی بڑی

جتنی عام طور پر ہوا کرتی ہے لیکن محاورۃً "گز بھر لمبی کہہ لیجیے"۔ چمکتی ہوئی آنکھیں جن میں سنجیدگی نام کو نہیں دیکھنے کے انداز میں ایک قسم کی ڈھٹائی اور بے حیائی مزاج میں آوارگی اور طبیعت لاابالی ہے۔ شاعری، موسیقی، شطرنج، گنجفہ، چوسر وغیرہ غرض شرفا کے سب عیبوں پر تھوڑی تھوڑی دسترس ہے۔ کوئی کام آج تک کیا نہیں لیکن ہر کام کرنے کا شوق ضرور ہے۔ ہر مجلس میں آپ کو موجود پاؤ گے ہر محفل میں لوگوں کو آپ کا منتظر دیکھو گے۔ شیطان کا خیال کرو اور شیطان خود حاضر ہو جاتا ہے کے مصداق جہاں بھی ان کا ذکر خیر ہو وہاں بہ نفس نفیس تشریف لے آتے ہیں۔ لوگ ان کی باتوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ کبھی کبھی ڈانٹ بھی پلائی جاتی ہے لیکن ان پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا۔ عزاداری کی مجلس میں جاتے ہیں تو مجلس کی خاموشی کو توڑنے کا حق ادا کرتے ہیں۔ لیکن اس کار خیر کے بعد باتوں کا وہ طومار باندھتے ہیں کہ ماتم کی مجلس کو محفل رقص سمجھ لیتے ہیں۔ موت کتنی ہی ناگہانی کیوں نہ ہو مرنے والے کی موت کا صدمہ کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو ان پر فلسفہ موت و حیات کے مطالعے کا عالم تو کیا طاری ہوگا یہ تو ایک ہی سانس میں بیسوں باتیں کہہ جائیں گے جن کا تعلق نہ اس واقعے سے ہوگا اور نہ اس مجلس کے ماحول سے۔ رمضانی کی شادی، میاں جمن کی بزم نا و نوش، حمیدن کی محفل نشاط اور آغا صاحب کے مشاعرے کے ذکر کے ساتھ فلسطین کی جنگ، چاند کا سفر، کھیل کود، کرکٹ اور ہاکی اور نہ جانے کیا کیا بک جائیں گے کہ سننے والے دم بخود رہ جاتے ہیں۔ امیر خسرو زندہ ہوتے تو ان مل اور ملکرنیوں کے لئے کتنا مسالہ انھیں ان حضرت کی باتوں سے ملتا۔ سنتے ہیں بازار میں کوئی شخص سودا لے رہا تھا۔ دکاندار سے کچھ جھگڑا ہوا۔ اتفاقاً یہ بھی اُدھر سے گزر رہے تھے۔ عادت

سے مجبور تو تھے ہی جھٹ گاہک کی حمایت میں دکاندار کو ایک لیکچر پلانا شروع کیا۔ کیوں صاحب کیوں نہیں دیتے آپ ان کو سودا جب دام طے ہو گئے تو پھر پس و پیش کیسی؟ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ یہ زمانہ قانون کا زمانہ ہے دھاندلی کا نہیں اور پھر ہر چیز پر کنٹرول ہے۔ کنٹرول کا انسپکٹر میرے بھانجے کے دوست کا دوست ہے۔ کوتوال اور میں ایک ہی جگہ گانا سننے جاتے ہیں اور پھر تاجروں کی انجمن کے صدر بھی کون سے ایسے والئے ریاست ہیں کہ ان تک رسائی مشکل ہو۔ آج ہی کے اخبار میں آپ نے پڑھا ہو گا کہ بمبئی کے ایک کروڑپتی تاجر کو محض اس جرم میں سزا ہوئی ہے کہ اس نے گاہک کو بیٹھنے کے لئے کرسی نہیں دی تھی"۔ گاہک بیچارے حیران رہ گئے۔ وہ اخبار روز پڑھتے تھے لیکن اس قسم کی خبر انھوں نے آج تو کیا پچھلے پانچ دس دن میں نہیں پڑھی تھی۔ دکاندار سے ان کا جھگڑا کسی اور نوعیت کا تھا اور یہ حضرت لے بیٹھے اس بات کو کہ دام طے ہو جانے پر بھی چیز نہیں ملتی۔ انھوں نے اس دخل در معقول بلکہ غیر معقول پر آپ کو پھٹکارا۔ دکان دار نے بھی سخت سست کہا۔ انہوں نے جواب میں گالی دی۔ گالی سن کر دکان دار نے دھول دھپّے سے کام لیا۔ کچھ لوگ جمع ہو گئے ان میں کچھ جانے پہچانے آدمی بھی تھے انھوں نے دیکھا کہ حضرت بانوتی پٹ رہے ہیں تو ہنستے قہقہے مارتے انہیں پٹتا ہی چھوڑ کر چلے گئے۔

ایسے واقعات بانوتی صاحب کو روزانہ پیش آتے رہتے ہیں۔ سُنا ہے جب تک ایک بار کہیں سے ڈانٹ ڈپٹ کے دو چار گھونٹ نہ مل جائیں یا لات گھونسے سے مرمت نہ ہو جائے آپ خود کو کھوئے کھوئے سے پاتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ دن بے مزہ گزرا۔ ماشاء اللہ سیاسیات سے بھی آپ کو کچھ کم شغف نہیں

کہیں تقریر ہوتی ہو تو آپ ضرور پہنچیں گے۔ کوشش کریں گے کہ مقرر کے آنے سے پہلے انہیں تقریر کا کوئی موقع مل جائے لیکن محفل کو برہم کرنا ہو تو آپ کو موقع دیا جائے۔ اوّل اوّل تو ایک آدھ بار موقع ملا تھا اب منتظمین آپ کے نام سے واقف ہو گئے ہیں اس لیئے اب ایسا موقع نہیں ملتا۔ لیکن یہ کب رکنے والے ہیں تقریر کے بعد جب جلسہ برخاست ہو تو یہ کہیں نہ کہیں مجمع لگا ہی لیتے ہیں۔ بس پھر تو مقرر کی تقریر کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں اور ناروا کلمات سے اسے یاد کیا جاتا ہے بیسوں گپیں اِدھر اُدھر کی ہانکی جاتی ہیں۔ ایک بات کا دوسری بات سے تعلق نہیں ہوتا۔ لوگ ہنستے ہیں اور مذاق اڑاتے ہیں مستم ظریف شرارت پر آمادہ ہوتے ہیں ایک دوسرے کو دھکا دیتا ہے۔ یہ دھکا پیل ریلے میں تبدیل ہو جاتی ہے اور حضرت باتونی بھیڑ میں دب کے رہ جاتے ہیں۔ کوئی ٹوپی لے اڑتا ہے کوئی سر پر چپت جما کے بھاگ جاتا ہے۔ غرض وہی درگت ہوتی ہے جو ان کا حصۂ خاص ہے بلکہ یوں کہیئے گا کہ ان کا مقصدِ خاص۔ کچھ لوگوں نے آپ کو مشورہ دیا کہ آپ میں تقریر بازی کا جوہر بدرجہ اتم موجود ہے آپ دوائیاں بیچا کریں۔ چنانچہ آپ نے "دوائی فروشانہ" مجمع لگانے کا شغل بھی اختیار کیا اور وہاں بھی آپ موقع اور محل کے خلاف باتیں کرنے لگے۔ ذہنی توازن کے پیچھے تو لٹھ لیئے پھرتے ہی ہیں۔ اپنی عادت کے مطابق جا و بے جا باتوں کے طومار باندھنے لگے۔ اور فحش گوئی پر اُتر آئے۔ وہاں بھی ایک دل جلے نے آپ کو جھوٹا مکار اور دغاباز کہنے کے ساتھ آپ کے ایک دو طمانچے بھی رسید کر دیئے۔ شیشیاں توڑ پھوڑ ڈالیں اور گھر کو رخصت کر دیا۔

لیکن حضرت باتونی ہر جگہ نہیں ٹلتے۔ کبھی کبھی سفر پر جاتے ہیں تو تھرڈ کلاس

کے ڈبے میں آرام سے سفر فرماتے ہیں۔ بھیڑ کتنی ہو آپ کو جگہ ضرور مل جاتی ہے۔ سارے کے سارے ڈبے کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ سگریٹ مفت پیتے ہیں پان مفت کھاتے ہیں۔ اپنا اتا پتا کسی کو کچھ بتائیں گے کسی کو کچھ۔ آنکھیں مٹکاتے ہیں۔ کولھے ہلاتے ہیں آواز میں صوتی اتار چڑھاؤ کے ساتھ ایک عجیب عالم پیدا کرتے ہیں کبھی ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہیں گویا کسی گہری فکر میں گرفتار ہیں۔ کبھی موٹر سائیکل کی پھٹ پھٹ کی طرح بے ہنگام باتیں کرتے جائیں گے۔ تھرڈ کلاس کے مسافروں پر اپنے علم اور معلومات کی وہ بارشِ کرتے ہیں کہ سب پر ایک سحر کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ ان میں سے کم ایسے ہوتے ہیں جنھیں سفر کی صعوبت کے باوجود ان حضرات کے اقوال کا صحیح جائزہ لینے کا دھیان بھی ہوتا ہو۔ گرد وپیش کے لوگوں پر اپنا رنگ جماتے ہیں اور ہر اس بھلے مانس سے اچھے رہتے ہیں جو گاڑی میں کہیں خالی جگہ نہ دیکھ کر سینکڑوں میل کا سفر کھڑے کھڑے طے کرنے کو عین اخلاق سمجھتا ہے۔

ایک صاحب ہم سے شطرنج کھیلتے اور روز ہارتے۔ انھیں ایک دن خوب سوجھی باتونی صاحب کو ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی بلوا لیا۔ کھیل شروع ہوا تو باتونی صاحب ہم سے مخاطب ہوتے۔ ہم گھوڑے اور فیل کی چالیں سوچ رہے تھے اور باتونی صاحب اپنی باتوں کے گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ انھوں نے ہر ممکن طریق سے ہمارے انہماک پر حملے کئے۔ چیزوں کی گرانی کا رونا رویا۔ لیڈروں سے اپنی واقفیت کا ذکر فرمایا اپنی طبی معلومات کا مظاہرہ کیا۔ عرق سونف، رسیا ذدل، ۲۰،۳ نمبر کی گولی۔ دراکھشا ارشٹ اور نہ جانے کیا کیا بک گئے۔ نتیجہ یہی ہوا کہ ہم بہک گئے۔ ایک چال غلط چل گئے پہلے ایک پیادہ پٹ گیا پھر دوسرا مہرہ۔ بازی چوپٹ ہو گئی۔ ہمارے لئے

باعث ندامت تھا کہ ہم جو کسی اچھے سے اچھے کھلاڑی کی چال سے بھی مات نہیں کھا سکتے تھے ایک اناڑی کی چال سے مات کھا گئے۔ ہمارے مدمقابل نے باتونی صاحب کی پان اور سگرٹ سے مدارات کی۔ چائے منگوائی گئی اور ان کی خدمات کا صلہ دیا گیا۔ آخر یہ ہر جگہ پٹنے کے لئے ہی نہیں ہیں۔ کوئی نہ کوئی جگہ ایسی بھی ہے جہاں ان کی قدر ہوتی ہے۔

کبھی جی اداس ہو۔ وقت کاٹنا محال ہو۔ کوئی تشویش دامن گیر ہو تو انہیں پاس بٹھایئے۔ بیٹھتے ہی آپ کا غم غلط کر دیں گے۔ آپ کو خیال بھی نہ رہے گا کہ آپ کچھ ہی دیر پہلے کس عالم میں تھے۔ باتونی جب اپنے رنگ میں آتے ہیں تو پتے کی باتیں بھی کرتے ہیں لیکن ان کی باتوں میں مفہوم اور تطابق کو تلاش کرنے کے لئے ایسے ہی لمحات کی ضرورت ہے جب مفہوم اور تطابق کی ضرورت نہ ہو۔ کبھی انہیں اپنے ہم جلسوں کے ساتھ سرگرم گفتگو دیکھیں تو لطف آجائے۔ ہزار الف لیلہ ان کی گفتگو پر قربان۔ ہزار فسانہ عجائب ان کی باتوں پر نثار۔ ایک بات شروع ہوتی ہے تو ختم ہونے میں نہیں آتی۔ پھر ایک کو دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کی دُھن۔ دوسرے کو شکست دینے کا سودا۔ ضمنی باتیں معترضہ جملے، جملے نہیں بلکہ داستانیں اس گفتگو کا طرۂ امتیاز ہوتی ہیں۔ خاموش اور متین اصحاب کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے۔ سنجیدگی کو ایک ناقابل عفو گناہ بتایا جاتا ہے اور کم سخنی کو آدمی کا سب سے بڑا عیب

حاصل کلام یہ کہ باتونی کی ہستی ایک بہت دلچسپ ہستی ہے۔ یہ اتنی نفرت کی سزاوار نہیں جتنی نفرت اس سے کی جاتی ہے۔ اگر اس کی باتیں ایک قسم

کے مریض ہیں اضافے کی موجب ہوتی ہیں تو دوسری قسم کے مریض کے لیے سرمایہ تسکین بھی ہمیں انہیں دیکھ کر لطف حاصل کرنا چاہیے۔ ان کی بے محل باتوں کو بے محل سمجھ کر ان سے حظ اٹھانا چاہیے۔ مزاج نگار ان کے یہاں سے اچھا مسالا تلاش کریں۔ سنجیدہ مزاج شگفتگی کی جستجو کریں۔" غنیمت الغرض حضرت کا دم یوں بھی ہے اور یوں بھی"۔

کیا کیا نہ کیا نوکری کی خاطر

تجربہ گواہ ہے کہ نوکری سے بڑی لعنت کوئی نہیں لیکن اس کے باوجود کم سے کم اپنے ملک میں تو یہی دیکھا ہے کہ ہر شخص اس کے لئے بے تاب پھرتا ہے۔ ہمارے اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم کچھ اس ڈھنگ کی رہی ہے کہ تعلیم ختم کرنے کے بعد سوائے نوکری کی تلاش کے اور کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ اب جب کہ ہم آزاد ہو چکے ہیں تعلیم کی نئی راہیں تلاش کی جا رہی ہیں۔ ہماری دیرینہ دعا شاید کارگر ہو جائے کہ جو جرم ہم نے کیا ہے ہماری اولاد۔ اور ہمارے دوستوں کی اولاد بھی اس جرم کا ارتکاب نہ کرے زندگی بذاتِ خود ایک ایسا بوجھ ہے جسے برداشت کرنے کا فرض انسان نے اپنے اوپر لے کر کوئی خاص عقلمندی کا ثبوت نہیں دیا۔ پھر زندگی کے ساتھ نوکری کی مصیبت تو سمندِ ناز کو اک اور تازیانہ والی بات ہے۔

آپ شاید یہ سمجھیں گے کہ جو شخص جس جگہ ہے اُسی جگہ کی بُرائی کرتا ہے۔ مثال کے طور پر دوکان دار دوکان داری پر ہزار لعنت بھیجتا ہے۔ تجارت والے

کو تجارت سے نفرت ہے - پیشہ وروں کو اپنا پیشہ پسند نہیں - مزدور مزدوری سے نالاں اور سود خوار سود خواری سے ناخوش ہے یہ سب کچھ درست لیکن ان سب میں مبالغے کو دخل ہو سکتا ہے - آدمی کی فطرت میں تنوّع پسندی ہے - وہ تبدیلی چاہتا ہے شاید اسی جذبے کے زیر اثر وہ اپنے کام کاج یا پیشے کی برائی کرتا ہو لیکن صاحب نوکری تو ایسی بلا ہے کہ کچھ نہ پوچھئے - اس کے کاٹے کا کوئی منتر ہی نہیں۔ آپ کو اس میں بھی کوئی مبالغہ نظر آتے تو سنئے کہ ہم نے اس کے لئے کیا کیا پاپڑ بیلے ہیں -

جیسا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں آج کل کی تعلیم کا آخری مقصد نوکری ہے - چنانچہ ہمارے تصوّر میں ہمیشہ یہی رہتا تھا کہ پڑھنے کے بعد ہم کیا بن جائیں گے گاؤں میں پیدا ہوئے - ایک قصبے میں تعلیم پائی - محدود سا تصوّر تھا - اونچے عہدوں کے نام بھی نہیں معلوم تھے - یہی جانتے تھے کہ اسکول ماسٹر ہو جائیں گے یا ڈاکٹر بنیں گے لیکن کسے معلوم تھا کہ مقدّر میں کیا ہے - والدین کا شوق بھی یہی تھا کہ لڑکا میٹرک پاس کرے اور جلد کمانے لگ جائے - چنانچہ والد خود اسکول ماسٹر ہونے کی وجہ سے اس پیشے کے سخت مخالف تھے - قرعہ ڈاکٹری کے نام پر پڑا - میٹرک پاس کرتے ہی سرکاری میڈیکل اسکول کے پراسپکٹس کا مطالعہ شروع ہوا - دیکھا تو دو تین مہینے عمر کم نکلی - اب کیا کیا جائے چار سال کی تعلیم اور ایک سال انتظار میں ضائع ہو یہ کسی کو گوارا نہ ہوا اور ڈاکٹری کا خیال ترک کر دیا گیا - آج جب گاہ گاہ مختلف امراض کے شکار ہوتے ہیں اور ڈاکٹروں کے بل ادا کرتے ہیں تو اس گھڑی کو روتے ہیں - خود ڈاکٹر ہوتے تو اپنی جیب محفوظ رکھتے اور دوسروں

کی جیبوں پر ہاتھ صاف کرتے ۔ والد کے ایک شاگرد لکھنؤ میں کسی ٹیکنیکل اسکول میں تعلیم حاصل کرتے تھے ۔ ان کی انگیخت سے ہم میکینیکل انجینیر بننے پر آمادہ ہوئے اور ہمیں یاد ہے کہ پہلی بار جب ہم وطن سے لکھنؤ گئے تو ایسا معلوم ہوا جیسے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے پر پہنچ گئے ہیں ۔ وطن سے دس بیس میل سے زیادہ دور تو کبھی ہم گئے ہی نہ تھے ۔ خدا خدا کر کے لکھنؤ پہنچے ۔ بستر سر پر اور چارباغ اسٹیشن سے ٹیکنیکل اسکول پوچھتے پوچھتے اپنی منزل پر پہنچے ۔ مقابلے کے امتحان میں بیٹھے ۔ کامیاب تو ہوئے لیکن کسی وجہ سے داخل نہ کئے گئے ۔ وہیں ایک کرم فرما ملے انہوں نے ساری داستان سنی تو افسروں سے مل ملا کر منظوری حاصل کر لائے ۔ اور ہم داخل ہو گئے ۔ ورکشاپ میں تین چار دن کام کرنا پڑا تو علمی اور ادبی مذاق کا خون ہوتا نہ دیکھا جا سکا ۔ فاؤنڈری شاپ میں مٹی کے ریزے لگانا اور ڈھلائی کی ٹریننگ لینا ۔ ڈرائنگ ۔ لکڑی کے جوڑ بنانا الغرض ایک عجیب آفت تھی ۔ بستر سر پہ اٹھایا اسی اسٹیشن سے گاڑی میں سوار ہوئے اور وطن آ پہنچے ۔ نتیجہ یہی کہ ہم میکینیکل انجنیر بھی نہ بن سکے ۔ کالج میں داخل ہوئے لیکن ادھر سب کو یہ آرزو تھی کہ نوکری جلد ملے ۔ اوورسیر صرف دو سال میں بنتے تھے وہاں بھیج دئے گئے ۔ ذہن نے ملامت کی ۔ دماغ نے بغاوت کی لیکن ایک ہندوستانی وضع کے وفادار بیٹے کی طرح ہم اس راہ پر بھی چل پڑے جو ہمیں پسند نہ تھی ۔ مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہوئے ۔ دو سال تعلیم حاصل کی اور بالآخر ملازم ہو گئے ۔

یہاں یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ علمی مذاق کے ساتھ ساتھ شاعری کا مرض بھی لاحق ہو چکا تھا اور ہر وقت یہی کوشش رہتی تھی کہ آبادی سے دور

جنگلوں میں رہنے کے عوض شہری زندگی بسر ہو۔ انیس سال کی عمر اور اولین سیری کا کام۔ سب سے پہلے گھوڑے کی سواری کرنی پڑی۔ آج سے بائیس تئیس برس پہلے کی بات ہے کہ گاؤں کے لڑکے سائیکل چلانا بھی کم جانتے تھے اور ان میں ایک ہم بھی تھے۔ اس نوکری کی خاطر ہم نے اس زمانے میں بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائیں گھوڑے پر سوار ہوتے اور اکثر گر جاتے۔ سائیکل چلانا شروع کی تو ایک دن نہریں گرتے گرتے بچے۔ آٹھ دس مہینے صحرائی زندگی بسر کرنے کے بعد دل اور دماغ کی بغاوت اس بات پر آمادہ ہوئی کہ یہ کام بھی چھوڑ دینا چاہیے۔ اپنی تمام ادبی صلاحیتوں کا خون ہو رہا تھا اور جوانی کی شوریدہ سر انگیخت اسے برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس مختصر سی مدت میں دو تین بار ملازمت چھوڑی اور آخری بار تو اس ارادے کے ساتھ کہ دوبارہ یہ جرم نہیں کریں گے۔ آج ہم اس بات پر خوش ہیں بلکہ ہمیں فخر ہے کہ ہم نے اپنے اس عزم کو کامیاب ہوتے دیکھا۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ترکِ ملازمت کے بعد پھر ملازمت کا شوق دامن گیر رہتا تھا۔ اسے بزدلی سمجھیے یا عام انسانی کمزوری کہ گھر کی ضرورتوں اور دوسری ذمہ داریوں کا احساس اس قدر غالب آتا تھا کہ سب ارادے متزلزل ہو جاتے تھے۔ اور ترکِ ملازمت کے بعد پھر تلاش ملازمت کا سلسلہ جاری ہو جاتا تھا۔ ہر چند ہم نے محسوس کیا کہ ملازمت میں ذہنی خودکشی بھی ہوتی ہے۔ خودداری کا خون بھی ہوتا ہے۔ جھوٹ بولنا بھی ضروری ہوتا ہے اور خود غرضی کے تحت احباب کو دھوکا بھی دینا پڑتا ہے۔ نااہل افسروں اور با اثر ساتھیوں کی خوشامد بھی کرنی پڑتی ہے لیکن اس کے باوجود پھر یہ شوق دامن گیر ہوا کہ کوئی نوکری تلاش کی جائے۔

اس زمانے میں اوورسیری کی ملازمت کو لوگ سونے کی کان کہتے تھے۔ بہت سے رشتہ دار اور دوست جب ملتے اور انھیں ترکِ ملازمت کا علم ہوتا تو ہماری عقل پر ملامت کرتے۔ عقلمندوں کے اس گروہ میں ہم ہزار دلیلیں پیش کرتے لیکن نقّار خانے میں طوطی کی آواز دب کر رہ جاتی۔ بڑے صاحب کے چپڑاسی کو انعام نہ دو۔ ٹھیکیدار کی بدعنوانیوں کو اس سے تھوڑی بہت رشوت لے کر چھپا دو۔ دیانتدار بننے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی دیانتدار نہ بن سکو۔ شعر وادب سے دور کا بھی واسطہ نہ رکھو یہ مصیبتیں اس زندگی میں پیش آئیں۔ ان کا ذکر کرتے تو کوئی نہیں سنتا تھا۔ کوئی کہتا کہ خود تم ہی نالائق ہو گے۔ کوئی کہتا کہ رشوت لی ہوگی اس لئے نکال دیئے گئے۔ الغرض بیکاری پر ان لوگوں کی باتیں تازیانے کا کام کرتیں۔

زمانہ اچھا ہی تھا کہ بار بار ترکِ ملازمت کے بعد بھی ملازمت مل جاتی تھی گھر والوں کے کوسنے کو برداشت کرنا بھی مشکل تھا۔ تھوڑی سی کوشش سے ہم ایک صنعتی اسکول میں مدرس ہو گئے۔ مشاہرہ بہت کم تھا مگر ذہنی استقلال نصیب ہوا۔ پہلی زندگی بڑی پر آشوب تھی۔ پڑھنے لکھنے کو وقت ملنے لگا۔ شعر و سخن کی محفلیں جمنے لگیں۔ شطرنج کے کھلاڑی دور نزدیک سے آنے لگے گویا افلاس کے زمانے میں بھی مٹتی ہوئی جاگیرداری کا ایک دھندلا سا نقشہ ہماری زندگی پیش کرنے لگی۔ شعوری طور پر یہ صحت مندی کے نشان تو نہیں تھے لیکن ان کے ہوتے ہوتے خود اپنے آپ پر ذہین ہونے کا شبہ ضرور ہوتا تھا اور اسی شبہے میں آج تک زندگی بسر ہو رہی ہے۔ ملازمت کے فرائض میں سب سے

ضروری کام لڑکوں کو ڈرائنگ پڑھانا تھا۔ تعلیم کے زمانے میں جس مضمون سے نفرت رہی وہی مضمون معاش کا ذریعہ بنا۔ ایک دو سال نہیں پورے بارہ سال کے لئے بائیس سے چونتیس سال کی عمر کا زمانہ جسے زندگی کا بہترین حصہ کہنا چاہیئے اس کام کی نذر کیا۔ خیال یہی ہوتا کہ اگر یہ ملازمت بھی چھوڑ دی تو پھر کہیں ٹھکانہ نہیں ملے گا۔ طبیعت کبھی کبھی اچاٹ ہو جاتی۔ مشغلۂ زندگی اور فطری مذاق میں مناسبت نہ پاکر افسوس ہوتا۔ ایک ولولہ سا اٹھتا اور دب کے رہ جاتا۔ سب سے بڑی کوفت جو اس ملازمت میں برداشت کرنی پڑی وہ کم علم لوگوں کی رفاقت تھی۔ صنعتی ادارے میں تعلیم دینے والے اپنے فن کے تو ماہر ہوتے ہیں لیکن علم سے قریب قریب کورے ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے لئے ان کی صحبتیں صحبت ناجنس کے برابر تھیں۔ دنیا میں آدمی کے لئے جو فطرت سے مجلس پسند ہے ناجنس کی صحبت ایک بہت بڑی سزا ہے۔ یہ سزا بھی ہم نے بھگتی۔ کوئی بڑا آدمی اسکول میں وارد ہوتا تو ہمارا تعارف شاعر کی حیثیت سے کرایا جاتا اور سب سے بڑی کوفت یہ ہوتی کہ ہر طرف سے نظم کہنے کے تقاضے ہوتے۔ وزیر صاحب تشریف لا رہے ہیں یا فلاں ابن فلاں آ رہے ہیں۔ ایک مصیبت ہم پر نازل ہوتی۔ انکار کرتے تو چھوٹے بڑے سب ناخوش ہو جاتے۔ پستی کی طرف ذہن مائل ہوتا تو کبھی کبھی یہ بھی خیال کرتے کہ وزیر صاحب کی خوشامد کریں گے تو کچھ نہ کچھ لے مریں گے۔ چنانچہ خوشامدی نظمیں لکھنے کے لئے کوئی نہ کوئی ذہنی جواز پیدا کرتے اور شاعری کے گلے پر کند چھری پھیرتے۔ لوگ واہ واہ کرتے۔ ہوس اپنے پروں پہ اڑاتی۔ عقل ملامت کرتی۔ شعور طعنے دیتا۔ ان بے ہودگیوں کے داغ ماضی کی پیشانی

پر دیکھتے ہیں تو آج بھی اپنے آپ کا مضحکہ اڑاتے ہیں خدا کسی فن کار کو ایسی مصیبت میں نہ پھنسائے۔ سچ پوچھیے تو فن کے اس ذلت آمیز استعمال کے بعد خود کو فن کار سمجھنا بھی حماقت ہے۔ لیکن یہ سب کچھ نوکری کی خاطر ہوا جس کے بغیر ہم سمجھتے تھے کہ پیٹ بھرنے کو روٹی نہیں ملے گی۔

بارہ سال کی اس طویل مدت میں ادائے فرض کے سلسلے میں پولیس۔ عدالت نیلام کی دکان۔ حاکم ضلع۔ میونسپل کمیٹی۔ بھنگی۔ کہار۔ دیسی صاحب۔ ولایتی صاحب اور نہ جانے کس کس سے واسطہ پڑا اور کس کس کی بارگاہ میں سلام بجالانا پڑا۔ جائز سلام تو اچھے مذاق کا ثبوت ہے لیکن ناجائز سلام بے غیرتی اور بے حمیتی کا نشان ہے۔ نوکری میں یہ بھی گوارا کرنا پڑتا ہے۔ اور قابل افسوس بات یہ ہے کہ ذاتی جوہر اور قابلیت اتنے کامیاب نہیں ہوتے جتنا ناجائز سلام بند پانی میں فساد کی بو آتی ہے۔ ذوق کا یہ قول ہم پر بھی صادق آنے لگا اور بالآخر اس طرز زندگی سے اکتانے کے بعد ہم دفتر میں کلرک بن گئے لڑائی کا زمانہ تھا۔ نئی نئی ملازمتیں نکل رہی تھیں۔ شہر سخن کے ایک حقیقی قدر دان نے ہم کو پستی سے اٹھانے کی کوشش کی۔ اسکول کی مدرسی سے دفتر کا کلرک بنا دیا۔ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ سکون قلب جو تھوڑا بہت میسر تھا وہ بھی جاتا رہا۔ ہوس تیز ہونے لگی۔ ٹوٹے ہوئے بال و پر سے اونچا اڑنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ نئے ڈھنگ کا کام تھا محنت زیادہ کرنی پڑی۔ دن فائلوں کی نظر ہوتا راتیں اسی سوچ میں گزر جاتیں کہ آخر انجام کیا ہوگا۔ یہ ملازمت نہ رہی تو پھر کہاں جائیں گے۔ وہیں جہاں سے تشریف لائے ہیں تو کیا فائدہ تھا اس عارضی تبدیلی کا۔ بیٹھے بٹھائے

آفت مول لی - لیکن آپ جانتے ہیں کہ انسان کہیں ہو رو ہنس کے یا ہنس رو کے وقت کاٹ ہی لیتا ہے - وقت کٹتا گیا - ملازم جتنا پرانا ہوتا جائے اتنا ہی بے غیرت بھی ہو جاتا ہے - اب ہمیں نا اہلوں کی دھونس - ناجائز دباؤ وغیرہ سب کچھ گوارا تھے - چنانچہ اسی کا فیض ہے کہ جہاں بھی ہم گئے کامیاب کہلائے - کلرک سے اسٹینیٹر - لٹریری اسسٹنٹ نشر و اشاعت کے محکمے کے ایک چھوٹے سے افسر - پھر کلرک اور اس کے بعد ادارتی ذمہ داریوں میں بتدریج گرفتار ہوئے - ان میں سے ہر ملازمت کا دور اپنی نوعیت کے لحاظ سے الگ ہے - اور ہر دور کی دلچسپیاں ذکر کے قابل ہیں لیکن اتنے تھوڑے وقت میں یہ فسانہ عجائب ختم نہیں ہو سکتا اس زمانے میں عجیب عجیب آدمیوں سے واسطہ پڑا - عجیب عجیب واقعات پیش آئے - اچھے تجربے بھی ہوئے اور بُرے بھی - لیکن بازی گر کی طرح جو کچھ ہوا پیٹ کی خاطر ہوا اور اس پر بھی ہر طرف سے "میں نے نہ مانی" کی صدا بلند رہی -

ایک دفعہ ایک مشہور مقرر کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا - ان کی طبیعت ناساز تھی، عذر فرمانے لگے - عذر تقریر کا یہ عالم کہ پانچ گھنٹے گزر گئے ابھی تقریر شروع نہیں ہوئی تھی - یہ تو محض عذر تقریر تھا - یہی حالت ہماری ہے کہ بیس بائیس برس ملازمت کرتے گزر گئے ابھی تک ترکِ ملازمت کا خیال دل سے نہیں گیا - ترکِ ملازمت کو کئی بار عملی صورت بھی دی گئی لیکن سخت جانی کا یہ عالم ہے کہ دوبارہ پھر ملازمت حاصل کر کے اپنی حماقتوں میں اضافہ کیا گیا - اس دورِ ملازمت میں جو دلچسپ نکتے ہاتھ آئے ہیں مختصر طور پر ان کا ذکر بھی سُن لیجیے افسر غلط بھی کہے تو اسے درست ماننا ضروری ہے ورنہ تم نالائق سمجھے جاؤ گے -

ماتحت کے ساتھ گھُل مل کر باتیں کرنا ضبط و نظم کی توہین ہے۔

جو ایک دن پہلے ملازم ہو وہ لائق جو ایک دن بعد آئے وہ پہلے سے نالائق۔

وقت ضرورت جھوٹ بولنا اتنا ہی اچھا ہے جتنا سچ بولنا۔

غیرت اور خودداری کے امراض میں مبتلا آدمی ملازمت کے قابل نہیں ہوتا۔

ناجائز خوشامد ایک جائز بات ہے اور سب کے لئے ضروری ہے۔

اپنی قابلیت کے باب میں ہمیشہ مبالغے سے کام لو یہ انکسار کا مقام نہیں۔

سرزنش ملے تو شربت کا گھونٹ سمجھو ماتحت کی شکایت کرو افسر کی حمایت

بہ ظاہر دیانت دار رہو حقیقت خواہ کچھ ہی ہو۔

یہ ہیں کامیابی کے راز۔ ان گناہوں کا ارتکاب ہم ہمیشہ کرتے آئے ہیں بس ایک ہی لغزش ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ نوکری کی ہمیشہ مذمّت کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ضرورت سے زیادہ کامیابی نہیں ہوتی جس کا کھائیں اسی کو کوسیں یہ کہیں کی شرافت ہے نہ مصلحت۔ نوکری کی خاطر جو کچھ ہم نے کیا وہ ہم نے بیان تو کر دیا لیکن وہ باتیں جن سے کسی کی توہین ہو جائے یا جو ہمیں قانونی مجرم ٹھہرا دیں۔۔ بیان میں نہیں آسکیں کاش ان کے ذکر کی اجازت ہوتی اور یہ کہانی روکھی پھیکی نہ رہتی۔

آخر میں آپ دعا کریں کہ ترکِ ملازمت کی آرزو پوری ہو اور ہم بخیر و خوبی پچپن سال کی عمر پانے سے پہلے پنشنر بن سکیں۔

جلد لوٹا دوں گا

زندگی پریشانیوں کا مجموعہ ہے اور سچ پوچھئے تو یہی پریشانیاں زندگی کو دلچسپ بھی بناتی ہیں۔ اگر زندگی میں کوئی تشویش نہ ہوتی، سکون اور اطمینان ہوتا ایسا سکون اور اطمینان کہ طبیعت پر کسی بات کا بوجھ نہ ہوتا غم پاس نہ پھٹکتا رنج درد اور کرب کا عالم نہ پیدا ہوتا تو یقیناً یہ زندگی دلچسپ نہ ہوتی۔ ہرگز اس قابل نہ ہوتی کہ کوئی اس کی آرزو کرتا۔ سکھ چین تو سب چاہتے ہیں لیکن اس لئے کہ سکھ چین کی کمی ہے۔ اگر سکھ اور چین ہی ہوتے پریشانیاں نہ ہوتیں تو کوئی سکھ چین کی تمنا ہی نہ کرتا۔

اس زندگی میں ہزاروں قسم کی پریشانیاں ہیں کچھ پریشانیاں ایسی ہیں جو آسمانی کہلاتی ہیں۔ انسان انہیں تقدیر کے لکھے کا نام دیتا ہے اور اپنی مجبوری کو جائز ٹھہرا لیتا ہے۔ لیکن اس وقت ہمیں ایک ایسی پریشانی کا ذکر کرنا ہے جو کم و بیش اپنے آپ پر خود ہی نازل کی جاتی ہے۔ "جلد لوٹا دوں گا" ایک ایسا عام ہتھیار ہے کہ ہر شریف آدمی جب کسی سے کوئی چیز مانگتا ہے اور اس نیت سے مانگتا ہے

کہ لوٹا دینے کا وعدہ کرنے کے باوجود لوٹانا مقصود نہیں تو وہ دوسرے حیلے حوالوں کے ساتھ اسے بھی استعمال کرتا ہے۔ اور یہ ایک ایسا پرتاثیر نسخہ ہے جو ایک بااصول اور سخت سے سخت دل کو بھی موم بنا دیتا ہے۔ جلد لوٹانے کا وعدہ کیا۔ چیز مانگ کر لے گئے اور خود بھی گم وہ چیز بھی گم۔ کبھی مدت کے بعد ملاقات ہو اور چیز کی واپسی کا تقاضا ہو جائے تو نسیان کا بہانہ، معذرت، معافی، واسطے الغرض ہر ترکیب اور ہر ڈھنگ سے بات ٹالی جاتی ہے۔ جلد لوٹا دینے والوں میں کتابیں مانگنے والوں کا نمبر سب سے پہلا ہے۔ ایک پروفیسر صاحب ہمارے دوست ہیں۔ ہم ان سے ایک کتاب مانگنے گئے۔ گفتگو کے دوران میں فرمانے لگے "کیا کریں یہ کتابیں مانگنے والے تو پیچھا نہیں چھوڑتے۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان لوگوں نے ہم نے کالج کی نوکری چھوڑی تو چھ سو روپے ان کتابوں کی قیمت ادا کی جو دوست ہمارے نام پر لائبریری سے لے گئے تھے اور ان میں ہر شخص یہی کہتا تھا "جلد لوٹا دوں گا" ہزار لعنت اس جلد لوٹانے پر۔

اب یونی ورسٹی میں نہیں تو اب بھی یہی حال ہے کوئی نہ کوئی دوست یا عزیز نازل ہوتے ہیں اور کتابوں کی ایک فہرست ہمارے سامنے رکھ دیتے ہیں کہ یونی ورسٹی لائبریری سے یہ کتابیں منگوا دیجئے۔ شریف آدمی کہاں تک ٹالے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کتابیں منگوا لی جاتی ہیں اور نذر کر دی جاتی ہیں۔ واپس لوٹا دینے کا وعدہ تو ہمیشہ ہوتا ہے لیکن لوٹاتا کوئی نہیں۔

اب بتائیے جس دوست کا یہ حال ہو اس سے کوئی کتاب مانگے تو کیا مانگے۔ ہم نے کتاب کا ذکر ہی نہ چھیڑا اور یہ سوچتے رہنے کہ واقعی پروفیسر صاحب

دوستوں کی عنایت کا نشانہ بن چکے ہیں یا مسلسل تقاضوں نے انہیں اس قدر تجربہ کار بنا دیا ہے کہ ہمارے جیسے بھک منگوں کا منہ بند کرنے کے لئے وہ ایسی گفتگو چھیڑ دیتے ہیں۔ اس کے برعکس ایک دوسرے حضرت ہیں کہ انہیں کتابوں کا بہت دھیان رہتا ہے۔ کتابیں جمع کرنے کی دُھن ہے اور ایک اچھی خاصی لائبریری کے مالک بن گئے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ کسی کو کتاب مستعار نہیں دیتے۔ حالانکہ یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ انہوں نے کم و بیش تمام کتابیں ادھر ادھر سے مانگ کر ہی جمع کی ہیں۔ ہر کتاب سے وہ ورق غائب ہے جس پر مالک کا یا لائبریری کا نام درج ہو ان سے پوچھیے تو مانگنے کے ہزار گُر بتائیں گے لیکن سب سے کارگر گُر یہی ہے کہ جلد لوٹانے کا وعدہ کیجیے اور کتاب لے آئیے۔ پھر دینا دلانا سب بھول جائیے۔

روزمرہ کی زندگی میں دیکھیے ہر شخص کو یہ شکایت کرتے ہوئے پائیے گا کہ یہ چیز کوئی لے گیا وہ چیز کوئی لے گیا۔ اسی طرح بیسیوں چیزیں گم ہو گئیں۔ حلوائی کے گلاس درجنوں کی تعداد میں گم ہو جاتے ہیں۔ سوڈا بیچنے والوں کی کمائی کا ایک حصہ گُم شدہ بوتلوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ کوئلے بیچنے والوں کی بوریاں گم ہو جاتی ہیں لیکن ان سب پر مستزاد روپے پیسے کا گم ہونا ہے ہر شخص کو کسی نہ کسی ایسے دوست یا محض ملنے والے سے واسطہ پڑتا ہے کہ دس بیس روپے اس وعدے پر لے گیا کہ دو ہی دن میں ادا کر دوں گا لیکن وہ دو دن دو مہینے بن جاتے ہیں گاہ گاہ دو سال بھی اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دو دن کی یہ مدت کبھی ختم ہی نہیں ہو پاتی۔

عام طور پر لوگ کہتے ہیں کہ خدا انھیں ان کے دشمنوں سے بچائے اس کے بعد

کچھ ذہین لوگوں نے یہ نعرہ بھی لگایا کہ خدا انہیں ان کے دوستوں سے بچائے لیکن حق بات یہ ہے کہ دشمنوں اور دوستوں سے بھی زیادہ خطرناک بعض ہمسائے ہیں اور ہم تو سب سے یہ کہتے ہیں کہ ہمیں ہمارے ہمسایوں سے بچاؤ۔ اخبار پورا پڑھ بھی نہیں پاتے کہ آدھمکیں گے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں گے لیکن مقطع سخن وہی روز کی فرمائش ہوگی "کیا میں اخبار لے جا سکتا ہوں۔ بس ابھی لوٹا دوں گا" سچ پوچھیے تو دل پر ایک بجلی سی گر جاتی ہے۔ دوسرے کے شوق کی بھی یہ لوگ پروا نہیں کرتے اتنا بھی خیال نہیں فرماتے کہ آخر اخبار روزانہ خریدتے ہیں۔ انہیں پڑھنے کا موقع پہلے ملنا چاہیے۔ ہاتھ سے چھین لیتے ہیں عجب بے تکی باتیں کرتے ہیں "ہاں چین ختم ہو جائے گا کیا۔ فلسطین کیا بٹ کے رہے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اناپ شناپ سوال کر دیں گے" واللہ آج کی سُرخی تو واقعی سنسنی پیدا کرنے والی ہے۔ لائیے ذرا دیکھوں تو، ابھی لوٹا دوں گا ذرا سُرخیاں دیکھ لوں" ادھر ہم ہیں کہ اپنا سا منہ لے کر بیٹھ جاتے ہیں سوچتے ہیں کہ ٹیسٹ میچ کا اسکور بھی نہ دیکھا اور یو این او کی کارروائی بھی نہ پڑھی۔ حضرت اخبار اُٹھا کر لے گئے اتنے میں دفتر کا وقت ہو گیا ہم بھی اخبار وغیرہ سب کچھ بھول گئے دفتر پہنچے تو وہاں کام میں لگ گئے پھر کس کو یہ خبر کہ سیاست کیا بلا ہے اور دنیا کی بساط پر کیا کچھ ہو رہا ہے۔ شام کو لوٹے تو اخبار کو ڈھونڈا اخبار کہاں ملتا۔ ابھی لوٹا دینے والے صاحب نے وعدے کی پابندی کبھی کی ہی نہیں۔ چنانچہ خود گئے۔ دروازے پر دستک دی حضرت ابھی گھر پر نہیں۔ اخبار مانگا تو بچے پھٹے ہوئے کاغذوں کے کچھ پرزے ہاتھ میں دے گئے آگ ہی تو لگ

گئی تن بدن کو۔ اور پریشانیاں کیا کم ہیں جو یہ نئی پریشانی جان کا عذاب بن کر نازل ہو گئی ہے۔

گھر میں کبھی خط لکھنے بیٹھو۔ تو قلم دوات گم، اِدھر دیکھو اُدھر دیکھو ڈھونڈ نہ کہیں پتہ نہیں۔ کبھی بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں کبھی جھلا کر بیوی کو صلواتیں سناتے ہیں۔ سارا گھر قلم دوات ڈھونڈنے میں مصروف ہو جاتا ہے اور آخر پتہ چلتا ہے کہ وہ تو ہمسائے صاحب تین دن ہوئے لے گئے تھے فوراً لوٹا دینے کا وعدہ فرما گئے تھے۔ اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ بُردں کی جان کو کوئی کہاں تک اور کب تک روئے۔ قلم دوات منگوائی تو اس کا بھی وہی حشر دیکھا جو اخبار کا نظر آیا۔ نِب کسی نے توڑ ڈالا۔ روشنائی کسی نے انڈیل دی گویا ایک نیا مشغلہ اور ملا کہ خط لکھنا منظور ہو تو پہلے قلم دوات کو درست کریں گھنٹہ آدھ گھنٹہ ضائع کریں۔ نقصان الگ اور پریشانی الگ کئی بار گھر میں تنبیہہ کی گئی ہے کہ کوئی مانگنے آئے تو اسے قلم دوات کبھی نہ دو مگر سنتا کون ہے اور گھر والوں کا بھی کیا قصور ہے خود مانگنے والے بھی ڈھیٹ ہیں۔ جھوٹ بولو تو جھوٹ بھی کام نہیں آتا بہانہ کرو تو بہلانے کا توڑ ان سب کے پاس ہے اور پھر اس کا کیا جواب کہ ابھی پانچ منٹ میں لوٹا دوں گا۔ بھاڑ میں جائیے یہ پانچ منٹ میں لوٹانا ہم تو تنگ آ گئے صاحب! اتنے تنگ کہ شاید کسی دن مجبور ہو کر نقل مکان پر اتر آئیں چیز چوری ہو جائے تو آدمی صبر کر لیتا ہے۔ ویسے گم ہو جائے تو بھی برداشت کر لیتا ہے لیکن ہمسایہ مانگ کر لے جائے اور فوراً واپس نہ کرے تو بڑی ذہنی کوفت ہوتی ہے۔ انھیں حضرت کو بھیجے چاقو ان کے گھر میں نہیں، گھڑی ان کے پاس نہیں،

مہمان آئے تو ٹی سیٹ مانگتے پھریں گے - چارپائی اور بستر بھی مانگیں گے نام کے مانگے رام نہیں لیکن عمل کے سچ مچ مانگے رام ہیں - پھر کیا مجال کہ خود ہی کوئی چیز لوٹا دیں - کئی چیزیں تو صاف ہضم کر گئے - ہم نے ذرا شرافت سے کام لیا ایک دو ہفتے گزر گئے بعد میں تقاضا کیا تو صاف کہہ دیا کہ "میں تو اس وقت دے آیا تھا - یہ آپ کیا فرما رہے ہیں - کوئی اور لے گیا ہوگا ذرا حافظے پر زور دیجئے گا - بچوں سے پوچھئے کہیں پھینک نہ نہیں آئے ہیں اور آج کل تو باہر کا دروازہ ایک منٹ بھی کھلا نہیں چھوڑنا چاہیئے - بھانت بھانت کے ٹھگ پھرتے ہیں صحن میں برآمدے میں کوئی چیز رکھ نہیں سکتے - فوراً چوری ہو جاتی ہے" الغرض خود بری الذمہ ہو جاتے ہیں اور بیسیوں وہموں میں ہمیں مبتلا کر جاتے ہیں -

کہنے کو تو ایک معمولی سا وعدہ ہے کہ فلاں چیز لوٹا دی جائے گی لیکن ایسے ایفا اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے کہ وعدہ کرنے والا اخلاق کا بندہ اور باعمل انسان ہو اچھے اخلاق والے اور باعمل لوگ عام طور پر مانگنے کو زندگی کا معیار نہیں بناتے اور ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ جتنی چادر ہو اتنے ہی پاؤں پھیلائے جائیں - بسا اوقات دیکھا ہے کہ چھوٹی سی بات بڑی بات بن جاتی ہے اور ایک عام تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ کسی جانے پہچانے آدمی کو گھڑی دو گھڑی کے لئے سائیکل دی - ضروری کام کی بنا پر ان کی درخواست کو ٹالا نہ جا سکا - گھنٹے دو گھنٹے کے بعد وہ صاحب تشریف لائے بدحواس اور سراسیمہ - چہرے کا رنگ فق بات منہ سے نہیں نکلتی - اطمینان سے بات کرنے کو کہو تو جواب ملتا ہے کہ سائیکل کوئی اٹھا کر لے گئے - سائیکل کی چوری تو روز کا واقعہ ہے اور پھر اس میں زیادہ قصور سائیکل والے

کا ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں مشکل میں جان تو صرف اس کی ہو جاتی ہے اب وہ ہزاروں دلیلیں پیش کرتے ہیں کہ بس ایک منٹ کا ہی تو کام تھا سائیکل میں نے کھمبے کے ساتھ کھڑی کی اور ذرا دکان کے اندر گیا پلٹ کے دیکھا تو سائیکل گم۔ صاحب بڑی غلطی ہوئی کتنے کی تھی۔ دام لے لیجیئے گا۔

عجب مخمصے میں جان ہوتی ہے ایسے لمحات میں اب دام کتنے بتائے جائیں اور پھر ملنے والے آدمی دام لینا اچھا بھی معلوم نہیں ہوتا کیا کہیں گے۔ ان کے والد کہ ہم اتنے بے مروت ہو گئے۔ اس جھنجھٹ کے علاوہ پولیس میں رپورٹ، سائیکل کے نمبر کی تلاش، بھاگ دوڑ، ایک مصیبت کا سامنا ہو جاتا ہے پھر یہ خیال کہ اپنی سائیکل ہوتی تو شاید یہ صاحب احتیاط کرتے۔ برائی تو تھی ہی کھو دی، یہ بھی خیال آتا ہے کہ خود ہمیں صاف جواب دے دینا چاہیئے تھا۔ اب خود کردہ کا علاج ہی کیا ہے۔

کہنے کا مطلب یہی کہ یہ چھوٹی سی بات کتنی پریشانی کا موجب بن جاتی ہے لیکن جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے زندگی پریشانیوں سے ہی دلچسپ بنتی ہے ایسے بھی لوگ ہیں جو ان مواقع پر خوش مذاقی کے سہارے ہر چھوٹی بڑی مصیبت کو برداشت کر لیتے ہیں اور ہونا بھی یہی چاہیئے آخر ان باتوں کو جان کا گاہک بنا لینا عقلمندی تو ہو نہیں سکتا۔ اس سلسلے میں ایک قصہ یاد آ گیا۔ دیہات کا واقعہ ہے ایک نوجوان اپنے سسرال جا رہا تھا چار پانچ میل کا فاصلہ نہ ریل نہ ٹانگا۔ پیدل ہی جانا پڑتا تھا۔ ساتھ ایک گنوار دیہاتی کو لے لیا اسے بھی شوق تھا کہ دولہا کے ساتھ جائے وہاں خاطر مدارات ہو گی دعوت اڑائی جائے گی چنانچہ اس نے بھی دولہا کی طرح اجلے کپڑے پہنے راستے میں پانی سے گزرنا تھا۔ دولہا کی شلوار پانی اور کیچڑ

کے چھینٹوں سے آلودہ ہو گئی۔ انہوں نے اپنے ساتھی کی خوشامد کی کہ وہ اپنی شلوار دے دے۔ سسرال پہنچتے ہی کوئی انتظام کیا جائے گا اور شلوار لوٹا دی جائے گی۔ چنانچہ شلواریں آپس میں بدل لی گئیں۔ دولہا سسرال پہنچے تو گاؤں بھر کی عورتیں انہیں دیکھنے آئیں۔ ایک ٹولی آئی تو انہوں نے دولہا کے ساتھی سے کہا کہ دولہا کہاں ہیں انہوں نے سامنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ دولہا وہ بیٹھے ہیں چارپائی پر لیکن شلوار میری ہے۔ عورتیں چلی گئیں لیکن دولہا میاں بڑے ناراض ہوئے اور کہنے لگے تم نے یہ کیوں کہا کہ شلوار میری ہے۔ بیچارا گنوار گھبرایا تو ضرور لیکن خاموش رہا۔ دوسری ٹولی آئی تو انہوں نے وہی سوال کیا دولہا کہاں ہے اس نے جواب دیا کہ دولہا وہ سامنے بیٹھے ہیں لیکن شلوار میری نہیں۔ اب جو عورتیں گئیں تو دولہا نے بہت ڈانٹا اور کہا کہ دیکھو شلوار کا ذکر مت کرو۔ تیسری ٹولی آئی تو ان کے سوال کے جواب میں بھی ویسا ہی جواب دیا اور کہا کہ دولہا تو سامنے بیٹھے ہیں شلوار کا ذکر میں نہیں کروں گا دولہا بہت سٹ پٹائے جلد کوئی نہ کوئی انتظام کیا اور ساتھی کی شلوار اسے لوٹا دی۔

مقصد اس قصے کے بیان کرنے کا یہی ہے۔ کہ چھوٹی چھوٹی پریشانیوں میں اگر دماغ کے توازن کو درست رکھا جائے اور خندہ پیشانی سے انہیں برداشت کر لیا جائے تو زندگی ان باتوں سے نسبتاً کم تلخ ہوتی ہے۔ اور بعض اوقات تو ظرافت اور خوش مذاقی کے پہلو نکل آتے ہیں اور زندگی اپنی لاتعداد ناخوشگواریوں کے باوجود ناخوشگوار محسوس نہیں ہوتی۔

اشتہار اور سائن بورڈ

رفتار کی ترقی اور ترقی کی رفتار دونوں مہلک بیماریاں ہیں۔ ان کے فضل وکرم سے انسانی دماغ کا سکون اور انسانی مزاج کی سنجیدگی کچھ اس طرح غائب ہوئے ہیں جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔ آمد و رفت کے ذرائع وسیع ہوئے۔ رفتار نے ترقی کو پر لگائے امکانات و ممکنات کی حدیں پھیلتی گئیں۔ گاؤں کا رہنے والا شہر میں پہنچا۔ صوبوں کا تعلق دوسرے صوبوں سے ہوا اور ملکوں کا دوسرے ملکوں سے۔ میل جول بڑھا تو ضروریات زندگی بھی بڑھ گئیں۔ مانچسٹر کا کپڑا، جرمنی کی دوائیں، جاپان کے کھلونے، فرانس اور پرتگال کی شراب، ایران کے قالین، امریکہ کے پرانے کوٹ اور ہندوستان بیچارے کا کچا مال دنیا کے دوسرے ملکوں میں گیا۔ تجارت کے ساتھ ساتھ انسانی ہوس کو فروغ ملا۔ اپنی چیز کا ڈھنڈورہ ہر طرف پیٹنے کے لئے اشتہار کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پریس کے لئے یہ ضرورت ایجاد کی اصلی ماں نہیں تو سوتیلی ماں بنی۔ اب دیکھو تو یہ عالم ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جسے اشتہار کا روگ نہ لگا ہو۔

تجارتی کمپنیاں، نشر و اشاعت کے ادارے، کالج، اسکول، یتیم خانے، سینما، تھیٹر، دواخانے الغرض جدھر بھی جاؤ خدا کا نام شاید ہو نہ ہو، اشتہار کا چرچا ضرور ہے۔ جہاں اشتہار کی گرمی نہیں وہاں سرد بازاری کا زور ہے۔ عبادت خانوں میں خدا کی عبادت کا اشتہار اور گنہگاری کے نام نہاد تفریح خانوں میں گناہ کا اشتہار عام نظر آتا ہے۔ اشتہار کی کرامت سے کیا نہیں ہوتا۔ نااہل کما کھاتے ہیں۔ نقلی مال اصلی بن کر بک جاتا ہے۔ قانون شکنی کئے بغیر جیبیں کتری جاتی ہیں۔ چار سو بیس کا اقدام کئے بغیر دھوکا دیا جاتا ہے۔ راکھ قیمتی کشتوں کے نام پر بک جاتی ہے۔ کھوٹا بُرا بھی ہو تو چل جاتا ہے مرد زنانہ نام سے دوائی بیچ سکتا ہے اور عورت مردانہ نام سے۔ ٹوٹی ہوئی جھونپڑی میں رہنے والا بھی ٹٹیا محل، جھولا محل اور راج محل جیسے پتوں سے دنیا کو گمراہ کر سکتا ہے فلم کا اشتہار کامیاب نہیں تو فلم ناکام۔ دوائی کا ڈھول نہیں پیٹا جاتا تو دوائی خود کھاؤ۔ ایکٹریس کا نام دلفریب اشتہاروں سے اُچھالا نہیں جاتا تو ایکٹریس گمنام۔ سچ پوچھو تو اشتہاری نسخوں اور تعویذوں سے بھی زیادہ زود اثر نسخہ یا تعویذ اگر کوئی ہے تو وہ اشتہار ہے۔

غیر ممالک میں اشتہار بازی کے فن کو باقاعدہ سیکھا اور سکھایا جاتا ہے۔ اچھا اشتہار تجویز کرنا اور بنانا گو الگ الگ فن ہیں لیکن باقاعدہ تربیت سے طلبا کو اس قابل بنایا جا سکتا ہے کہ دونوں میں سے کوئی ایک صلاحیت رکھنے والے میں ضرورت کے مطابق دوسری صلاحیت بھی پیدا کر دی جائے۔ ادیب اور آرٹسٹ ایک ہی مکان میں رہنے والے نہیں تو ہمسایے ضرور ہیں۔ بحث کے جھنجھٹ سے بچنے کے لئے ہم خود ہی مان لیتے ہیں کہ ادب برائے آرٹ ہے اور آرٹ برائے ادب اسی طرح ہے جیسے زندگی

برائے ادب اور ادب برائے زندگی ۔ اچھے اشتہار کی تخلیق کرنے والے ادیب آرٹسٹ یا آرٹسٹ ادیب کے لئے ضروری ہے کہ وہ دونوں صلاحتیں رکھتا ہو۔ اُسے بہ یک وقت اگر اچھا آرٹسٹ اور اچھا ادیب ہونا ضروری نہیں تو کم از کم اتنا تو چاہیئے کہ اگر وہ اچھا آرٹسٹ ہے تو ادب سے بھی اسے کچھ لگاؤ ہو اور اگر اچھا ادیب ہے تو آرٹ سے بھی کچھ علاقہ ہو۔ آرٹ کے معنی ہمارے نزدیک صرف تصویر بنانے کے ہیں۔ اس لفظ کے ان وسیع معانی سے ہمیں سروکار نہیں جن کے تحت یہ لفظ اس طرح ایک معمّا بن گیا ہے جس طرح اردو کا جدید شاعر۔

گنجان آبادی والے مغربی ممالک میں اشتہار بازی کے فن نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ اشتہار کے لئے ہر ممکن ذریعے کا استعمال کیا جاتا ہے۔ لاسلکی ۔ موٹر کار ۔ ہوائی جہاز سے اشتہار بانٹے جاتے ہیں بلکہ یوں کہئے کہ پھینکے جاتے ہیں ۔ آسمان میں اڑنے والے غباروں کے ذریعے سے اشتہار بازی کی جاتی ہے ۔ در و دیوار ، چلتی پھرتی گاڑیاں ، بجلی اور تار کے کھمبے ، تفریح گاہوں کی بنچیں ، دعوتی رقعے ، ڈاک خانے کے ٹکٹ ۔ غرض جہاں بھی جاؤ اشتہار کا دیوتا براجمان نظر آئے گا ۔ اہل مغرب کی ہر بات میں سلیقے اور قرینے کو دخل ہے ۔ بادشاہ پرستی میں سلیقہ ، بغاوت میں سلیقہ ، دعائے امن میں قرینہ ، جنگ آفرینی میں قرینہ ۔ جہاں نفاست اور متانت سے کام لینا ہو وہاں نفاست اور متانت سے کام لیا جاتا ہے جہاں سنسنی اور ہنگامے سے کام نکلتا ہو وہاں سنسنی اور ہنگامے پیدا کئے جاتے ہیں ۔ خدا کی شان کہ جس عورت کو شوہر نہیں ملتا اور جس مرد کو بیوی نہیں ملتی وہ اشتہار کے سہارے اپنی مراد پاتے ہیں ۔ ایسے اشتہاروں میں صداقت کے اظہار میں دیانت داری کا بھی خیال رکھا جاتا ہے ۔ عورت سابقہ خاوندوں کے

نام پیش کرتی ہوئی اپنی ناکام محبت کا رونا رو دیتی ہے۔ مرد سابقہ بیویوں کی فہرست پیش کرتے ہوئے اپنے غیر مستقل عشق اور تلوّن مزاجی کا اعتراف کر لیتا ہے۔ ہوٹل سینما گھر، کلب، لائبریری، قہوے خانے سب جیتے جاگتے اشتہار ہیں۔ یہاں ہر اچھی بُری چیز کا اشتہار کامیاب ہو سکتا ہے۔

مغربی اشتہار بازجن خاص باتوں کا خیال رکھتے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں :-

۱- اشتہار کا صحیح عنوان اور مضمون

۲- عام فہم عبارت اور جاذب توجہ تصاویر

۳- رنگین اشتہاروں میں رنگوں کا صحیح انتخاب

۴- اشتہار کے لیے صحیح مقام اور ذریعے کا انتخاب

۵- مذاق کی تبدیلی کے ساتھ اشتہار میں ایسی تبدیلی جس سے اشتہار کا تسلسل نہ ٹوٹنے پائے اور اس کی اِنادی حیثیت پر ضرب نہ لگے۔

صحیح عنوان اشتہار کے لئے اسی قدر ضروری ہے جس قدر نسوانی حُسن کے لیے غازہ یا جدید افسانہ نگار کی کتاب کے لئے جاذب نظر جلد پوش۔ عنوان جاذب توجہ نہیں تو سارا اشتہار بے کار۔ سیدھا سادا عنوان ہو تو اسے سو فیصدی سچّا سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے کیونکہ آج کل کی دنیا میں سو فیصدی سچائی کا دوسرا نام بے وقوفی ہے۔ انشورنس کمپنی کا اشتہار ہو تو کہو "موت کے بعد کیا ہوگا" اور اس کے بعد ان عزیز و اقارب کی پریشان حالی کا ذکر کرو جنہیں سرپرست یونہی چھوڑ کر اچانک مر جاتا ہے۔ کپڑے دھونے کے صابن کا اشتہار ہو تو دھوبی کے

جھوٹے وعدے، یا بیوی کی بے پروائی، کا ذکر عنوان میں ہونا چاہیئے۔ اپنی دوائی کے مُؤثر ہونے کا راگ الاپنا ہو تو کہو "دواؤں سے مرض اور بڑھتا ہے" اور نیچے لکھو ہمارا مطلب بازاری اور عام دواؤں سے ہے۔ یستثنیٰ پیدا کرنا چاہو تو اردو ہندی کے کسی روزانہ اخبار کے عنوانات کی پیروی کرو، فساد کی روک تھام۔ سیلاب کی تباہ کاریاں، قحط سے لاکھوں مر گئے، دیوالہ نکل گیا، دن دھاڑے لوٹ، نگاہیں لڑ گئیں، سلیپر سے مرمّت الغرض کتنے عنوان ہیں جو حسب پسند اور حسب ضرورت گھڑے گھڑائے مل سکتے ہیں۔

اشتہار کی عبارت عام فہم ہونی چاہیئے۔ "تماشائے بہ یک کف بُردنِ صد دل" کی یہاں ضرورت نہیں اور "مندوبین موتمر بین الاقوامی میں اختلاف" کی یہاں گنجائش نہیں۔ حسب ضرورت تصاویر بھی اشتہار کا جزو ہونی چاہئیں۔ عبارت عام فہم ہو گی تو ہر پڑھنے والا اُسے سمجھ لے گا۔ حسب حال اور حسب موقع تصویر ہو گی تو مفہوم زیادہ واضح ہو جائے گا۔

رنگوں کا صحیح انتخاب رنگین اشتہار اور سائن بورڈ کی جان ہے۔ جہاں یہ نہیں وہاں مقصد براری کم ہوتی ہے۔ سفید زمین پر سیاہ رنگ کی عبارت اور تصویر زیادہ جاذب ہو گی۔ گہرے رنگ کی زمین پر گہرے رنگوں کا استعمال آرٹسٹ کی فنی استعداد میں کمزوری پر دلالت کرتا ہے اور اشتہار دینے والے کی بدذوقی پر۔

اشتہار کے لئے صحیح مقام اور ذریعے کا انتخاب اسی طرح ضروری ہے جس طرح سودا سلف کے لئے صحیح دکان پر جانا۔ نہ یہ کہ حلوائی سے نہاری مانگو اور گراموفون بیچنے والے سے کسٹرائیل۔ جس علاقے میں جس چیز کی کھپت ہے اس کا اشتہار وہیں

فائدہ دے گا۔ پھر یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اشتہار کے لیئے کسی اخبار کو ذریعہ بنایا جائے یا پوسٹر یا پمفلٹ کا سہارا لیا جائے۔ کسی واعظ یا مقرر کی ضرورت ہو تو اسے آزمایا جائے۔ ووٹ لینا چاہو تو تانگوں اور لاریوں پر پوسٹر چسپاں کر دو۔ تیل صابن بیچنا چاہو تو فلم ایکٹریس کی تصویر اور سند کو پوسٹر یا اشتہار کا جزو بنا دو۔ طبابت کا لوہا جمکانا ہو تو جھوٹے سچے راجوں مہاراجوں کے سرٹیفکیٹ پیش کرو۔ اشتہار کو اس کا ساتھ دینا ضروری ہے۔ زمانہ سے مذاق میں جو تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ اشتہار کو اس کا ساتھ دینا ضروری ہے آج فلموں کی مقبولیت کا اندازہ اگر ان کے شاندار ہفتوں کی تعداد سے لگایا جاتا ہے۔ تو ممکن ہے کل اسے کسی وجہ سے ناپسند کیا جائے۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن اگر مصنف کی ادبی یا مجلسی حیثیت سے جلد بک جائے تو ممکن ہے دوسرے ایڈیشن کے بکنے کے لیئے یہ دلیل زیادہ معاون نہ ہو۔

ہمارے یہاں اشتہاروں کی فنی اور ادبی حیثیت عام طور پر پست ہے اور اس کی وجہ اس سلسلے میں تربیت کی کمی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ضرورت زمانہ اور مغربی اشتہار بازی کے نمونوں کا اثر ہماری اشتہار بازی پر نمایاں ہے۔ محض اشتہاروں کو جمع کر کے اگر ایک کتاب مرتب کی جائے تو یہ مجموعہ تفریحی اعتبار سے ایک اچھا خاصہ معجون بن جائے۔ سنیاسی ٹوٹکے۔ خاندانی مجربات، پرستان کے دلفریب نظارے، حب مراد، گوکے پنڈت کے راز ہائے سربستہ، کوہ قاف کی پریاں، جوتشی کی کرامات، عملیات کے چمتکار، طوائف کی آپ بیتی، ایکٹریس کی رام کہانی، شہزادیوں کے خطوط، یاروں کے لیئے تحفے، شباب کی راتیں۔ نئے اور پرانے زاویے، غرض کیا نہیں ملتا۔ ذرا فلمی اشتہاروں کی طرف دیکھیئے تو حسن کی

قصیدہ خوانی کا لطف حاصل ہو جائے۔ پریوں اور اپسراؤں کا ناچ، ناچ اور زندہ ناچ جادو بھری آنکھیں، چھلکتا ہوا شباب، مچلتی ہوئی جوانی، حُسن اور رومان کا بہتا ہوا دریا، مے نوش نگاہیں، پُراسرار حسینہ، وجد آفریں رقص، اس پار اور اُس پار کی دنیا، اچھوتا خیال، اچھوتا انداز اور اچھوتی کہانی۔ فلموں کے ناموں کے متعلق تو آج یہ حال ہے کہ فلم کے لیے نیا نام تلاش کرنا اسی قدر مشکل ہے جس قدر شاعر کے لیے نئے تخلص کی تلاش۔

دواؤں کے اشتہار تو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ شاید ملک بھر میں کوئی تندرست انسان ہی نہیں اور پھر دوائیں بیچنے والوں نے شاید انسانی جانوں کی تجارت کا بھی لائسنس لے رکھا ہے۔ ان کے ہاں جھوٹ کا نام سچ ہے اور فریب کا نام دیانت ذرا ان کے اشتہاروں کے عنوان دیکھیے۔ نمبر سے کشتی، کیلاش پربت کی بوٹیاں اولاد کی گارنٹی، سائنٹفک علاج، پچھتائیں مت، اکسیرِ کُل، اندھے سجاکھے، دُھند غبار، جالا اور موتیا گم، قیمت بعد میں، دس ہزار روپیہ انعام۔ خدا کی قسم، پرماتما بھلا کرے وغیرہ وغیرہ۔ بعض تو اس بات پر نازاں ہیں کہ وہ خاندانی حکیم ہیں اور سو پُشت سے پیشۂ آبا طبابت چلا آتا ہے بعض اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ وہ خاندانی حکیم، وید یا ڈاکٹر نہیں۔ کسی درویشِ کامل یا سنیاسی کا خاص عطیہ ان کے پاس ہے۔ دوائی مُفت دیتے ہیں۔ اشتہارات اور دوسرے خرچ کے لئے پانچ دن کی دوائی صرف پانچ روپے کے عوض دیتے ہیں۔ اور بھی ہزاروں قسم کے اشتہار دیکھنے میں آتے ہیں۔ ضرورت ملازمت، جنگلات کا نیلام، مویشیوں کی منڈی۔ ریل گاڑیوں کے اوقات میں تبدیلی، دھرم ارتھ چندے کے لئے اپیل، اطلاعِ عام، متندہ

اور تیزی ضرور بڑھے اور ہمت بڑھے۔ دماغی کوفت اور چائے کا گھونٹ، خوراک کی قلت، قحط کے آثار، سب کچھ اور کچھ نہیں۔ یہ تو تھا اشتہاروں کا حال بالکل یہی حالت سائن بورڈوں کی ہے۔ ہمارے سائن بورڈوں میں سائز کا غلط تناسب اور رنگوں کا غلط انتخاب عام پایا جاتا ہے۔ مضحکہ خیز عبارت اور ہجوں کی غلطیوں کی بہتات ہے۔ افسوس یہ ہے کہ سرکاری محکموں میں بھی ان غلطیوں کو روا رکھا جاتا ہے۔ مرکز روک تھام پلیگ، ٹکڑہ ہائے اراضی برائے فروخت۔ اڈہ ہائے تانگہ ہا۔ ہر امراض کا علاج، شرح عام اور اسی قسم کی زبان کی غلطیاں اب عادت میں داخل ہو گئی ہیں۔ دودھ اور دہی کی خالص دکان، تیل اور صابن کی سستی دکان سبزی اور پھل کی تازہ دکان اور اسی قسم کی دکانیں جگہ جگہ دکھائی دیتی ہیں۔ شاعری چونکہ غیر معیاری اشتہاروں اور سائن بورڈوں کی طرح غیر معیاری ہو چکی ہے اس لئے اشتہارں اور سائن بورڈوں میں غلط شعروں کا استعمال بھی عام ہے۔ زندگی زندہ دلی کا ہے نام کے عوض زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔ سائن بورڈوں، اشتہاروں حتٰی کہ اخباروں کی پیشانی پر بھی استعمال ہوتا ہے۔

ہمارے یہاں ایک مشہور طبیب ہیں۔ غریب کو دوائی نہیں دیتے۔ دوائی کی قیمت سب سے زیادہ وصول کرتے ہیں۔ فیس آج تک کبھی چھوڑی نہیں اور اس کے باوجود اُن کے مُطب کے بورڈ پر یہ شعر لکھا ہوا ہے ؎

کانٹا چبھے کسی کے تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

نیا مضمون نویس ایڈیٹر سے

دنیا میں کوئی آدمی پیدا ہوتے ہی علم و فن میں ماہر نہیں بن جاتا۔ باقاعدہ تعلیم اور اس کے بعد تجربہ ہی قابلیت اور مہارت پیدا کرتے ہیں۔ بڑھئی، لہار، ریڈیو میکینیک ماسٹر۔ پروفیسر۔ وکیل غرضیکہ ہر شعبے میں تجربے کے بعد ہی کچھ معقولیت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن جہاں ان شعبوں میں تجربہ حاصل کرنے کے مواقع بہت ملتے ہیں وہاں بیچارا مضمون نویس بڑی سخت مصیبت کا شکار رہتا ہے اسے تجربہ تو کیا حاصل ہو کوئی ایڈیٹر اسے پاس پھٹکنے ہی نہیں دیتا۔ بے چارا کرے تو کیا کرے۔ ایک ایسے ہی نو آموز اور مبتدی مضمون نگار کا رونا خود اس کی زبان سے سنیئے۔

کیا سنائیں صاحب۔ یہ آپ بیتی بڑی دردناک اور عبرت آموز ہے لیکن مجھے اس کا یقین ہے کہ میں آپ سب کی ہمدردی حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاؤنگا اس زمانے کے ایڈیٹر بڑے مغرور اور خود پسند لوگ ہیں۔ میں نے جب سب سے پہلا مضمون لکھا میرے دوستوں نے اس کی بڑی تعریف کی۔ گھر میں بیوی کو سنایا وہ گو

زیادہ پڑھی لکھی تو نہیں لیکن سوجھ بوجھ کی اچھی ہے۔ اس نے بھی بہت تعریف کی۔ خیران سب کے اکسانے اور ترغیب دلانے پر میں نے یہ مضمون ایک ہفتہ وار اخبار کو بھیج دیا۔ ایڈیٹر صاحب کو صاف صاف لکھ دیا کہ یہ میری پہلی کوشش ہے۔ ترمیم و تنسیخ تو ضروری ہوگی۔ اس کا آپ کو پورا اختیار ہے۔ ہاں اگر آپ حوصلہ افزائی فرمائیں گے تو بندہ کسی قابل ہو جائے گا۔ ساتھ یہ بھی لکھا کہ کوئی خدمت ہو تو بجا لانے کے لئے تیار ہوں۔ غرضیکہ ع۔ مضمون میرا پھر خدا چھاپ دیجئے۔

ایک نہایت ہی پُر خلوص اور عاجزانہ درخواست کی یہ بھی یقین دلایا کہ ہمارے علاقے میں آم بہت ہوتے ہیں۔ اب کے آموں کے موسم میں نہایت اچھے آم خدمت والا میں بھیجوں گا۔ لیکن ان سب باتوں کا اثر وہی ہوا جو عام طور پر ہوتا ہے۔ صدائے برنخاست) کوئی جواب نہیں۔ شاید ہمارے ملک میں صحافت کا یہی طریقہ ہے۔ میں نے یوں تو بہت جگہ یہ پڑھا ہے کہ دوسرے ملکوں میں ایڈیٹر بڑے خلیق اور با اخلاق ہوتے ہیں مضمون شائع ہو نہ ہو مضمون نگار کو اطلاع ضرور دیتے ہیں اور اگر کسی طرح مضمون واپس کرنا ہی مقصود ہو تو واپس کر دیتے ہیں۔ لیکن یہاں میں نے خط پہ خط لکھے کوئی جواب نہیں ملا۔ مضمون شاید ردّی کی ٹوکری میں چلا گیا۔ آخر تنگ آکر ایک جوابی خط لکھا اس کا دو حرفی جواب ملا۔ مضمون شائع نہیں ہو سکتا۔ کتنا تلخ لہجہ ہے مروّت تک نہیں برتی۔ کہہ دیتے کہ ہمارے مطلب کا نہیں یا جیسا کہ بعض اداروں کا دستور ہے مضمون کی اچھائی برائی کا ذکر کئے بغیر واپس کر دیتے اور ساتھ ہی ایک معافی نامہ بھی بھیج دیتے لیکن یہاں تو واسطہ ہی ایک فرعون مزاج مدیر صاحب سے تھا اب آپ خود ہی سوچیے کہ کیا یہ ایڈیٹر صاحب کبھی نئے مضمون نگار نہیں تھے کیا

کبھی انہوں نے پہلا مضمون نہیں لکھا تھا۔ اگر عمر بھر ان سے یہی سلوک ہوتا تو یہ اس مقام تک کس طرح پہنچتے۔ سچ پوچھئے تو مجھے خود ان کی قابلیت اور علم پر شک ہے غالباً وہ میرا مضمون ہی نہیں سمجھے۔ لیجئے ذرا اس مضمون کی تھوڑی سی تفصیل سن لیجئے۔ مضمون نہ علمی تھا نہ غلمی۔ سیدھا سا موضوع تھا۔ ورزش کے فائدے۔ اب اس میں ایسی کون سی بات تھی کہ اسے شائع نہ کیا جائے۔ اس میں میں نے ورزش کے تمام فائدے درج کر دئے تھے۔ مثلاً جسم تندرست رہتا ہے رگ اور پٹھے مضبوط ہو جاتے ہیں۔ لڑائی میں مضبوط جسم بڑا کام آتا ہے۔ تنومند آدمی سے بیوی بھی ڈرتی رہتی ہے۔ تھوڑا سا سخت کام کرنا ہو تو سانس نہیں پھولتی۔ بس ٹرام اور ریل میں جگہ آسانی سے مل جاتی ہے۔ اور اگر ضرورت پڑے تو آدمی اڑوس پڑوس پر دھونس بھی جما سکتا ہے۔ میرا خیال ہے حضرت ایڈیٹر صاحب کاہل قسم کے آدمی ہوں گے۔ کتابوں کے کیڑے۔ ہر وقت الول جلول لکھنے سے کام، پڑھنے سے تو خیر اس قسم کے ایڈیٹروں کو واسطہ ہی نہیں۔ بھلا انھیں کیوں پسند آتا یہ مضمون۔ عنوان دیکھا۔ مصنف کا غیر معروف نام پڑھا۔ پھاڑا اور ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک بتایا تھا کہ ایڈیٹر صاحب حقہ پینے کے عادی ہیں مضمون نگاروں کے مضمون جلا کر چلم سلگایا کرتے ہیں۔ اب آپ ہی انصاف کیجئے میں یہ مصرع دہراؤں یا نہیں ؎

انصاف کو آواز دو انصاف کہاں ہے

جس شخص کی پہلی کوشش پر اس طرح پانی پھر جائے وہ دوبارہ کب حوصلہ کر سکتا ہے۔ یہ تو کھلنے کو کھلتے ہی مسل دینے والی بات ہے۔ شعلے کو جلتے ہی بجھا

دینے کے مصداق ہے۔ کونپل کو پھوٹتے ہی توڑ دینے والا معاملہ ہے لیکن ہمّت اور جوانمردی کے صدقے میں نے تو یہ سبق اسکاٹ لینڈ کے ایک بادشاہ کی کہانی سے سیکھا تھا کہ ہمت نہیں ہارنا چاہیئے۔ وہ بادشاہ دشمنوں سے لڑتا لڑتا شکست پر شکست کھانے کے بعد کسی دُور افتادہ غار میں بیٹھا تھا کہ اس نے ایک مکڑی کو ایک خاص اونچے مقام پر چڑھتے دیکھا۔ نہ جانے کتنی بار وہ مکڑی منزل کے قریب پہنچ کر نیچے گری لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری آخر اپنی منزل کو جا لیا۔ بس یہی حال میرا سمجھیے پھر اکساہٹ ہوئی اور صاحب چھپنے کی حرص کسے نہیں ہر شخص اخبار یا رسالے میں اپنا نام مصنف کی حیثیت میں دیکھنا چاہتا ہے اس بار میں نے ایک اور ایڈیٹر صاحب کو تاکا۔ یہ میرے ایک دوست کے رشتہ دار ہیں۔ ان سے سفارشی خط لیا اور مضمون بھیج دیا۔ بڑی منّت سماجت کا لہجہ اختیار کیا۔ خوشامد، چاپلوسی اور نہ جانے کس کس جرم کا نادانستہ ارتکاب کیا لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات یعنی جواب ندارد۔ اب کے تو میں نے ایک افسانہ تصنیف کیا کہتے ہیں کہ خشک مضمونوں کو لوگ پڑھتے نہیں نظموں میں قدامت کی باتیں زیادہ ہیں البتہ افسانے بہت مقبول ہوتے ہیں۔ کسی علمی یا فنی کتاب کا ایڈیشن پانچ سال میں بھی ختم نہیں ہوتا۔ افسانے کی کتب کے ایڈیشن پر ایڈیشن نکلتے ہیں یہی خیال افسانے لکھنے کا محرک ہوا وہ بھی قبول نہ ہوا پلاٹ کسی انگریزی کہانی سے اُڑایا تھا۔ زبان اور انداز بیان مختلف مشہور مصنفوں سے اڑانے کی کوشش کی تھی۔ فقرے کے فقرے دوسروں کے تھے ترتیب دینے کا سلیقہ تو مجھ میں ضرورت سے زیادہ ہے ایسے جوڑ توڑ سے افسانہ لکھا لیکن ایڈیٹر صاحب نے اسے بھی پسند نہ کیا۔ کئی راتیں سیاہ ہوئیں شاید آٹھ

یا نو بار اسے لکھا اور صاف کیا - مُرغی اپنی جان سے گئی کھانے والے کو مزہ نہیں آیا - کچھ اس قسم کی بات ہو گئی۔ اس پر قیامت یہ کہ دو تین مہینے بعد ان ایڈیٹر صاحب نے اپنے پرچے میں ایک نیم مزاحیہ نمکدان لکھا - عنوان تھا "ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے" - اس عنوان کے تحت جہاں دو چار اور نو آموز مضمون نگاروں کی گت بنائی تھی - وہاں مجھے بھی دھر لیا گیا لیکن قیامت پر قیامت یہ کہ اتنا ذلیل کرنے پر بھی میرا نام نہیں لکھا - نام تو چھپ جاتا - رسوائی ہی کی صورت میں سہی - اب مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آں حضرت کو میرے دوست نے ہی کہیں بھڑکا نہ دیا ہو - انھوں نے پلاٹ کی چوری کا بھی ذکر فرما دیا - زبان و بیان اُڑانے کے نمونے بھی پیش کر دئے - اور ان عیب پر مستزاد جس چیز کا مجھے گمان تک نہیں تھا یعنی افسانے کی بے ترتیبی کا بھی رونا رو دیا - کوئی کہاں سے لائے ایسا مذاق جو دوسروں کے مطابق ہو - پسند اپنی اپنی ہے - اگر اتنا شعور مجھ میں ہوتا کہ خود ایڈیٹر کے دل کی بات لکھتا تو خود ہی ایڈیٹر کیوں نہ بن جاتا - یہ داستان جو آپ نے سنی ایک حقیقت ہے افسانہ نہیں - کہیں آپ اسے بھی افسانہ سمجھ لیں - بڑے بڑے خود پسند ایڈیٹروں سے واسطہ پڑا ہے - اس بات پر تو مجھے ذرا بھی اعتراض نہیں کہ وہ گھٹیا قسم کے مضمون کو ٹھکرا دیں لیکن اچھے مضمونوں کو بھی تو پسند نہیں کرتے - آخر میں بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا - ایک دن ایک نہایت ہی مشہور ادیب کے ایک مضمون کی پوری اور مصدقہ نقل اپنے نام سے بھیج دی - مقصود یہ تھا کہ دیکھئے اب کیا کہتے ہیں - اوّل اوّل تو جواب ہی نہیں آیا - لیکن جوابی خط بھیجنے پر اتنا جواب مل گیا کہ ابھی ذرا اور مشق کیجئے - یہ کوشش تو

کامیاب نہیں۔ کچھ دن میں چھپنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ تو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا۔ وہ مارا کہ بیٹا عمر بھر یاد کرو گے۔ یہ واقعہ ایک افسانے کی صورت میں لکھا اور ایک دوسرے ایڈیٹر صاحب کو بھیج دیا۔ بارے اب تو یقین تھا کہ سچ مچ کا دلچسپ افسانہ بڑی آب و تاب سے چھپ جائے گا۔ لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ یہاں تو آوے کا آوہ ہی خراب ہے۔ کس کا رونا روئیں۔ کس کی شکایت کریں جو دیکھو بوجھ بجھکڑ۔ جسے دیکھو جاہل اور ناتراش۔ یہ حال ہے اس زمانے میں ایڈیٹروں کا۔ ایک دن اپنے ایک دوست سے یہی شکایت کر رہا تھا کہ انھوں نے بڑی دلچسپ باتیں ایڈیٹروں کے باب میں سنائیں۔ کہنے لگے کہ ایک مشہور روزانہ اخبار کے ایڈیٹر بلکہ چیف ایڈیٹر یہ نہیں جانتے کہ ڈینیوب دریا ہے یا پہاڑ۔ چلّی ایک ملک ہے یا جانور۔ لنکا شائر کو وہ کسی شاعر کا تخلص سمجھتے تھے۔ روزانہ اخبار کے ایڈیٹر ہیں۔ اور یہ وسعت معلومات۔ ایک اردو کے ادبی رسالے کے ایڈیٹر صاحب پریم چند کو ایک شاعر بلکہ غزل گو بتاتے تھے کسی نے اعتراض کیا تو کہنے لگے ایک مہنت کے بہت سے چیلے تھے۔ چیلوں میں جھگڑا ہوا کہ بڑا چیلا کون ہے۔ سب مہنت جی کے پاس گئے انہوں نے کہا کہ آج جب بھکشا سے واپس آؤ تو اپنی اپنی جھولی دکھاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جس کی جھولی میں سب سے زیادہ آٹا تھا اسے مہنت جی نے بڑے چیلے کا عہدہ دے دیا۔ تو فرمانے لگے کہ پریم چند افسانہ نگار تھے یا شاعر۔ مجھے اس سے بحث نہیں۔ میری جھولی دیکھو۔ اس میں آٹا تو سب سے زیادہ ہے میں ایڈیٹر ہوں۔ اور ایک ادبی رسالے کا ایڈیٹر۔ آپ لوگ مضمون نگار ہیں۔ میرے

دروازے کے بھکاری - ہر وقت یہاں آکر صدا کرنے والے - جن کا سجدہ اس درگاہ میں قبول ہو جاتا ہے انہیں شہرت اور ناموری کی نعمتیں ملتی ہیں - جو لوگ محض ہمارا مذاق ہی اڑایا کرتے ہیں زمانہ ان کا مذاق اڑاتا ہے - انھیں کوئی پوچھتا ہی نہیں - چھپنے کی ہوس بری ہوتی ہے - ایک دن میں ایک انگریزی اخبار دیکھ رہا تھا جس میں ایسی ہی ہوس کے ایک واقعے کا ذکر تھا - امریکہ میں ایک آدمی کو چھپنے کی ہوس نے آگھیرا - مضمون نگار بنا - شاعری کی - فلم کی دنیا میں جھک ماری لیکن اخبار میں نام نہ چھپا - آخر ایک قتل کیا - عمر قید کی سزا ہوئی آٹھ دس سال جیل میں رہا - لیکن کسی اخبار کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ اس کا نام کسی صورت میں چھاپ دے - تنگ آکر اس نے جیل میں خودکشی کرلی - دوسرے دن اس واقعے کا ذکر اس کی تصویر کے ساتھ اخباروں میں چھپ گیا - میں روز یہ سوچتا ہوں کہ میرا بھی یہی حشر نہ ہو - یہ تو مانا کہ میں پختہ لکھنے والوں میں سے نہیں زیادہ تجربہ بھی نہیں لیکن یہ کیا ستم ہے کہ ہر کوشش ناکام رہے - آخر یہ ایڈیٹر بھی کہاں کے بڑے عالم یا قابل لوگ ہیں اگر ایسے ہی قابل ہوتے تو اس رسوائے عام پیشے میں کیوں جھک مارتے - کہیں آئی - اے - ایس بنتے - جج ہوتے اور اگر سیاست ہی گلے کا ہار بننا تھی تو پارلیمنٹ کے ممبر ہوتے - یہ تو تیسرے درجے کے ذہین لوگ بھی نہیں - قوم کے کردار کو خراب کرنا - اپنی بے علمی سے دوسروں کو گمراہ کرنا ان کا کام ہے -

ان سب باتوں کو رہنے دیجئے - ابھی حال ہی میں میں نے بڑے گہرے مطالعے کے بعد ایک مضمون لکھا - تین چار کتابیں ایک ساتھ پڑھ ڈالیں - مضمون تاریخی تھا - چنگیز خاں کی قبر - بڑے تاریخی حوالے تھے - بڑی محنت کا کام تھا

ایک بدذوق ایڈیٹر نے اسے شائع کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ پھر دوسرے کے پاس بھیجا۔ وہاں سے بھی یہی جواب ملا کہ مضمون قابل اشاعت نہیں لیکن ایک پڑھے لکھے اور سمجھ بوجھ والے ایڈیٹر کے پاس بھیجا تو وہ مضمون چھپ گیا اس کے ساتھ تعریفی نوٹ بھی تھا۔ میری معلومات کی بہت ستائش کی گئی اور حوصلہ افزائی کرتے ہوئے یہ امید ظاہر کی گئی کہ یہ نوجوان مستقبل میں ایک اچھا مضمون نگار بنے گا۔ اب آپ ہی بتایئے کہ پہلے دو ایڈیٹروں کے باب میں آپ کی کیا رائے ہے۔ کتنے واقعات ہیں جن کا ذکر کرنا خود کو ذلیل کرنا ہے لیکن کرنا پڑتا ہے۔ مختصر یہ کہ آدمی پر کوئی مصیبت ٹوٹ پڑے۔ جینا دوبھر ہو جائے۔ کوئی روگ لگ جائے لیکن مضمون نویسی کی بیماری لاحق نہ ہو۔ اس کے کاٹے کا منتر نہیں۔ لوگ ملازمت اور نوکری کو کوستے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس میں ہر وقت ذلت برداشت کرنی پڑتی ہے لیکن ہمارے ایڈیٹروں کے فضل و کرم سے کچھ کم ذلت مضمون نگاروں کی نہیں ہوتی۔ یہ سب باتیں کہنے کی تو نہیں تھیں لیکن کہہ گیا۔ اس خیال سے کہ دل کی بھڑاس تو نکل جائے۔ پورے واقعات کا تو یہ ایک حقیر حصّہ بھی نہیں۔ اور پھر آپ مانتے ہیں، جنگل میں رہ کے شیر سے بیر کون مول لے سکتا ہے۔ آخر یہی کام کرنا ہے۔ روز مضمون لکھنا ہے۔ اگر ان لوگوں کو ناراض کر لیا تو پھر کیا کریں گے۔ چھپنے کی امید مکمل مایوسی میں تبدیل ہو جائے گی۔ خیر اب تو چھپنے کی نوبت آنے لگی ہے۔ لیکن خدا اپنے بر خود غلط ایڈیٹروں کو سمجھائے۔ اے کاش ان کے دماغ میں یہ بات بھی آجائے کہ قوم کے نونہالوں کی نشو و نما اس طرح ہوا کرتی ہے کہ ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اگر خود تھوڑی سی محنت کی ضرورت ہو تو محنت کی جائے لیکن بغیر پڑھے

یا محنت کے خوف سے مضمون واپس نہ کیا جائے۔ میرا تو اب یہ ارادہ ہے کہ تنظیم کے اس زمانے میں نئے مضمون نویسوں کی ایک آل انڈیا کانفرنس کی جائے۔ اور اس میں اپنی مشکلات پر غور کیا جائے۔ بہت سی تجویزوں میں سے ایک تجویز یہ بھی ہوگی کہ کسی اخبار یا رسالے کے ایڈیٹر کو یہ اختیار حاصل نہ ہو کہ وہ کسی نئے مضمون نگار کا مضمون واپس کرے۔ گو یہ ایک ناممکن بات ہے لیکن نو آموز اور مبتدی کی ضد بھی تو بچوں کی سی ضد ہوا کرتی ہے۔ اتنی بڑی چیز مانگیں گے تو کوئی چھوٹی چیز ملے گی۔ دوسری چیز یہ ہوگی کہ کسی ایڈیٹر کو ہمدردی اور اخلاق کا نفسیاتی امتحان پاس کئے بغیر ایڈیٹر نہ مقرر کیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ آپ سب اس کانفرنس کے انعقاد کی اور میری تجویزوں کی حمایت کریں گے لیکن اس وقت کا انتظار کیجیے جب اس کانفرنس کے باب میں اعلان ہو۔ صرف اتنا بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کا صدر کسی ایڈیٹر کو نہیں بنایا جائے گا۔

مشاعرے

جنسِ دل جنسِ محبت اور جنسِ آرزو کی ارزانی کا شکوہ تو شعرا بھی کرتے آئے ہیں لیکن جنسِ مشاعرہ کی ارزانی کا گلہ یہ بھی نہیں کرتے۔ جنگ کے اثرات کی وجہ سے جہاں کھانے پینے اور پہننے کی چیزیں بازار میں کم ملتی ہیں اور اگر مل بھی جائیں تو گراں بہت ہیں۔ وہاں ہر قصبے اور شہر سے لے کر ہر اک گلی کوچے تک مشاعرے کا بازار گرم نظر آتا ہے۔ شعرا کی قیمت بڑھ جانے کے باوجود سستے شعروں کی فراوانی ہے۔ اشیاء خوردنی کا کال ضرور ہے مگر شعرا کا نہیں۔ اور اس کی وجہ مشاعرے کی اس قسم کی مقبولیت ہے جسے بھیڑ چال کہتے ہیں۔

محبوب کی موت پر محبوبہ کا نغمہ آمیز نوحہ، مصیبت کے وقت بے اختیار گانے کی آواز ہندوستانی فلموں کا روزمرہ ہے۔ انسانی نفسیات نہیں تو کم از کم ہندوستانی نفسیات کا شاید یہی تقاضا ہو۔ کڑی مصیبت یا رنج کے لمحات کے وقت انسانی دل و دماغ کسی ناپائدار خوشی یا وقتی کیفیت کا سہارا تلاش کرتے ہیں۔ اسی طرح

پُر آشوب زمانے کی دراز دستیوں اور فتنہ کاریوں سے عارضی طور پر نجات پانے کی غرض سے مشاعرہ اور اس قسم کی تفریحی تقاریب عام پسند ہو گئی ہیں۔ مشاعرہ بازی کی وبا اتنی عام ہو گئی ہے کہ دوسرے متعدی امراض کے نام کے ساتھ اب اس کا نام لینا بھی ضروری ہو گیا ہے۔

چائے بیچنے والوں کا یہ قول کہ گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے خود ان کے لئے مفید ہو تو ہو مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر پینے والا اور نہ پینے والا بھی اس پر لبیک کہے۔ اس دور میں مشاعرے کا انتظام کرنے والے مختلف اداروں کو مشاعروں کے انعقاد سے کوئی خاص فائدہ مقصود ہو تو ہو یہ بات واقعی فیصلہ طلب ہے کہ عوام کو بھی اس سے کوئی خاص فائدہ ہوتا ہے یا نہیں۔

"تقریب کچھ تو چاہیئے بہر مشاعرہ" کے مصداق آج کل تو کم و بیش ہر چھوٹی بڑی تقریب کے لئے مشاعرہ ضروری سمجھ لیا گیا ہے۔ ادبی انجمنوں کے مشاعروں کے علاوہ اور کتنی تقاریب ہیں جن کے سلسلے میں مشاعرے منعقد ہوئے اور ہو رہے ہیں عرس شریف، گئو شالہ کا میلہ، لیڈر کی برسی۔ وزیر کے اعزاز میں پارٹی۔ کالج کا سالانہ ڈنر، نشر و اشاعت کے جلسے، ختنے اور شادی کی تقاریب غرض جہاں بھی جاؤ مشاعرہ قوالی، کیرتن اور تفریح کے دیگر سامان کے ساتھ ساتھ جلوہ افروز ہے۔ چندہ فراہم کرنے والی انجمنوں کے لئے تو یہ ایک مؤثر ذریعہ بن گیا ہے اسکول اور کالج کے منتظم سالانہ جلسوں کے ساتھ مشاعروں کا انتظام بھی فرماتے ہیں۔ عوام کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ریڈیو پر بھی مشاعروں کا رواج ہو گیا ہے۔ بعض لوگ اپنے گھروں پر شعر و سخن کی محفلیں سجاتے ہیں۔ خدمت ادب سے زیادہ بڑے لوگوں سے

راہ و رسم پیدا کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ شعرا بے چارے شعر سنانے کی دھن میں پاپیادہ تشریف لاتے ہیں۔ واہ واہ سے جھولیاں بھر کے خالی ہاتھ واپس چلے جاتے ہیں۔ صاحب خانہ کسی نہ کسی نائٹ یا والی ریاست سے مشرّف بہ تعارف ہو جاتے ہیں۔ مشاعرے کی یہ فیض رسانی انھیں دین و دنیا میں ممتاز بنا دیتی ہے۔ شاعر کو کچھ ملے نہ ملے یہ ان کی بلا سے۔

مشاعرے کا تسلی بخش اہتمام کرنا اچھے اور اپنے منظورِ نظر شعرا کو اچھالنا، سامعین کی فرمائشوں کو حیلے حوالے سے ٹالنا، اسٹیج کو ہٹ دھرمی سے قابو میں رکھنا اپنی اپنی جگہ علیحدہ فن ہیں۔ اپنے لیے بھی اور اس قسم کے داعیانِ مشاعرے کے لیے بھی کچھ ایسے منتظم مفید ثابت ہوتے ہیں جن میں شعر کہنے کی صلاحیتیں تو کم ہیں لیکن اسٹیج پر بھانڈ کے فرائض اچھی طرح ادا کر سکتے ہیں۔

اکابر شعرا کو چھوڑ کر شعرا کی ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی ہے جو خدا کی عبادت یا بیوی کی خدمت سے چوک جائے تو چوک جائے مشاعرے میں شمولیت سے نہیں چوکتی۔ پابندیٔ وقت کے فراخ دل پابند۔ اور اتنے فراخ دل کہ مقامی مشاعروں میں وقتِ مشاعرہ سے پہلے پہنچتے ہیں اور بعد میں اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ غیر مقامی مشاعروں میں روزِ مشاعرہ سے کئی دن پہلے پہنچ جاتے ہیں اور مشاعرے کے بعد اس دن تک نہیں ہلتے جب تک کسی اور مشاعرے کی تاریخ نہ آ جائے۔ یا راشن کی مجبوریاں میزبان کو یہ کہنے پر مجبور نہ کر دیں کہ "بہ سلامت روی و باز آئی"۔

اس دور میں سیدھے سادے شعرا کی کمی نہیں لیکن جب دنیا بھر کی ذہنیت تجارتی ہو جائے تو وہ بے چارے کیا کریں۔ شعرا کی ایک کثیر تعداد اب لین دین کے معاملے میں جوڑ توڑ کی قائل ہے۔ منشی، محرر، وکیل، ڈاکٹر اپنی اجرت یا فیس لیتے ہیں، موسیقی

کی محفل میں سازندے سے لے کر گانے والی یا گانے والا اہل محفل سے رائج الوقت سکوں میں داد وصول کرتا ہے، مصوّر تصویر کی قیمت کا طالب ہے تو بے چارہ شاعر ہی کیوں رفاہِ عام کی درسگاہ بنا رہے - اب اس کی دنیا میں بھی فیس کے سادہ لفظ کے عوض حق، محنت، زحمتِ سفر اور نعل بہا کے پُر تکلّف لفظوں کا استعمال ہوتا ہے -

داد و سند کے کھرے کچھ کرم فرما ایسے بھی ہیں جو معاوضہ پہلے وصول کر لیتے ہیں اور تبدیلیٔ تاریخ پر نیا معاوضہ طلب فرماتے ہیں - بعض منچلے ایسے ہیں کہ پیشگی وصول کرنے پر بھی کسی نہ کسی عذر کے تحت مشاعرے میں شامل نہیں ہوتے اور پیشگی کو آئندہ کے لئے امانت کے طور پر محفوظ رکھ لیتے ہیں - غیر متوقع طور پر مشاعرے کا انعقاد نہ ہو سکے تو فیس اس اصول کے تحت وصول کی جاتی ہے جس اصول کے تحت ڈاکٹر مریض کے مرنے پر بھی اپنی تشریف آوری کا معاوضہ نہیں چھوڑتا -

اسے خوبیٔ قسمت کہئے یا شومیٔ تقدیر، مشاعرہ بازی اور اہتمام مشاعرہ ان دونوں مصیبتوں میں ہم خود بھی گرفتار رہ چکے ہیں بلکہ اب بھی ہیں اس سلسلے میں شعراء اور مہتمم مشاعرہ کے درمیان جو خط و کتابت ہوتی ہے ہمیں اس سے بھی واسطہ پڑا ہے - وہ اتنی دلچسپ نام نہاد وضع دارانہ، سبق آموز اور نہ جانے کیا کیا آموز ہوتی ہے کہ یہ رازِ درونِ پردہ بیان کرنے کے لئے رندانِ مست کی ٹولی میں شامل ہونا ضروری ہے اور یہ وہ منزل ہے جو ہم سے آج تک طے نہ ہو سکی -

مشاعرے کی تعریف میں یہ فقرے عام طور پر سنے جاتے ہیں کہ مشاعروں میں ہر قوم اور جماعت کے افراد شامل ہوتے ہیں اور یہی ایک مجلسی تقریب ہے جہاں اتحاد باہمی کو جامہ عمل پہنایا جاتا ہے - لیکن تجربے نے ہمیں بتایا ہے کہ خود شعرا حضرات

کا حال اس کے برعکس ہے - ان میں ہر فرد کا نظریہ جداگانہ اور زاویۂ نگاہ علیحدہ ہوتا ہے جوشِ اتحاد کی پوچھو تو قطعی نادارد۔ غلط قسم کی وضع داری، تجاہلِ آمیز تکبر اور خود ناشناسی کے جوہر عام ملتے ہیں - غزل اور نظم تحت اللفظ اور ترنم، جدید و قدیم، پڑھنے میں تقدیم و تاخیر، قطعہ و رباعی غرض کتنے ہی موضوعات ہیں جن کے تحت ہنگامۂ طعن و تشنیع گرم ہوتا ہے - سستی شہرت پانے والے ہلکے پھلکے قسم کے شاعران خوش گو شعرا کا مذاق اڑاتے ہیں جنھیں قدرت نے بجتی ہوئی آواز یا سازندوں کے انداز سے بہرہ ور نہیں کیا۔ اس ترنم میں سوز ہے، اس میں گلے کے داؤ پیچ، یہ چورن بیچنے والے کا ترنم ہے اور وہ کسی منہ چڑانے والے کا، الغرض جتنے منہ اتنی باتیں - اچھے ترنم کی پرستش ہوتی ہے تحت اللفظ کو کوئی پوچھتا ہی نہیں - شعر کیسا ہے اس پر اس لئے کم غور فرمایا جاتا ہے کہ شعر سمجھنے والے تھوڑے ہوتے ہیں -

اخلاقی اور ملکی قانون جن باتوں کو منع کرتا ہے انسان کی فطرت وہی کام کرنا چاہتی ہے - نیم برہنہ تصویریں زیادہ بکتی ہیں عریاں قسم کی فلمیں زیادہ کامیاب ہوتی ہیں فحش قسم کا لٹریچر قبولِ عام کی سند پاتا ہے یہی حال شعر کا ہے - پایۂ اعتبار سے گرے ہوئے اشعار پر داہ واہ ہوتی ہے - رنگین مزاج سننے والے جوبن اور انگڑائی والے اشعار پر سر دھنتے ہیں - کچھ اگلے وقتوں کے لوگ اپنے خاص انداز میں شعر کی باطنی خوبیوں سے قطع نظر صرف شعر کی ظاہری صورت کی داد دیتے ہیں - "کیا کہنے ہیں اس قافیے کے ---- کیا محاورہ باندھ دیا ہے - لفظ نہیں نگینہ ہے - ردیف کتنی مضبوط آئی ہے - بندش کتنی چست ہے الغرض اس قسم کے سکہ بند فقرے استعمال کئے جاتے ہیں - مکرر، سہ کرر بلکہ تاسحر پڑھنے کے تقاضے کئے جاتے ہیں جس شعر پر شاعر

داد چاہتا ہو بسا اوقات اس کا استقبال خاموشی سے کیا جاتا ہے۔ اک شور ہوتا ہے اک ہلڑ مچتا ہے صحیح ذوق شعر کم ہونے کی وجہ سے اچھے اشعار اور اچھے شاعر کی مٹی پلید ہوتی ہے۔ ناخوش آواز شاعر کو خدا غریق رحمت کرے بےچارا سامعین کی احتجاجی سیٹیوں کا شکار ہوتا ہے۔ پامال اور فرسودہ نظموں کی فرمائش کی جاتی ہے پچیس تیس برس پہلے جو چیز مقبول تھی اسے آج بھی مقبول قرار دیا جاتا ہے۔ شاعر کی ہمہ گیر طبیعت کی داد کے طور پر نہیں بلکہ اپنی جدت پسندی کے ماتم کے طور پر۔ بعض جگہ تو کور ذوقی اور کم سوادی اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ مسروقہ مال بھی وہاں کھپ جاتا ہے غلط گو بھی وہاں سُر تال سے ٹھیک ہو تو رنگ جما لیتا ہے، ایسے کلام کی داد بھی مل جاتی ہے جس کی کوئی چُول دُرست نہ ہو۔ مہمل گو کو صاحب فکر کا خطاب ملتا ہے اور ایسے اشعار کی داد بھی ملتی ہے جو اس کاف سے شروع ہوں جو نہ علت کا ہو نہ بیان کا

"کہ وہ شوخ جس گھر میں مہمان ہو گا"

اس قبیل سے ہے۔

مشاعرے کے منتظمین کی آج کل پہلی خواہش یہی ہوتی ہے کہ مشاعرے کو ریڈیو سے نشر کرنے کا انتظام کیا جائے۔ یہ ایک اچھی خواہش ہے مگر ریڈیو والے بچارے اسے کہاں تک پورا کر سکتے ہیں۔ ہر مشاعرہ اگر نشر کیا جائے تو گویا ریڈیو پر اور کوئی پروگرام ہی نہ ہو۔ خیر یہ تو رہا ایک طرف وہ کیفیت بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے جو ان شعراء پر طاری ہوتی ہے جن کا نام نشر کرنے والے شعرا کی فہرست میں نہیں آتا۔ منتظمان کی شامت آجاتی ہے۔ فرمائش، فہمائش، دھمکی، گزارش، سفارش الغرض ہر طریقہ اپنا نام لکھوانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض شعراء تو دوسروں کو

خود داری کا سبق اس لیۓ دیتے ہیں کہ خود ان کے لیۓ گنجائش نکل سکے۔ بعض محض ایک قطعہ یا رباعی پڑھنے پر ہی قانع رہنے کا وعدہ فرماتے ہیں۔ بعض کسی دوسرے کا نام تجویز فرما کر رواداری کا ثبوت دیتے ہیں بعض کو انتخاب میں جانب داری نظر آتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جانب داری ہر جگہ ہوتی ہے لیکن ایک خاص حد تک۔ بہت سی اور بھی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ جن کا ان لوگوں کو احساس نہیں ہوتا۔ جو ان مجبوریوں کی وجہ سے محروم رہ جاتے ہیں اور وہ خود ہی محروم نہیں رہ جاتے بلکہ ان کے ایسے بیسیوں لواحقین اور دوست بھی محروم رہ جاتے ہیں جن سے ریڈیو سیٹ پر حاضر رہنے کی درخواست کر کے یہ حضرت گھر سے مشاعرے میں تشریف لاتے ہیں۔

ہر کلیے کے ساتھ استثنا کا دُم چھلّا بھی ہوتا ہے اس افراتفری کے زمانے میں مشاعرے کی ضرورت سے زیادہ مقبولیت اس کی مخصوص افادی حیثیت پر ضرب لگا رہی ہے۔ لیکن ایسے مشاعرے بھی کبھی کبھی سننے کا اتفاق ہوتا ہے جہاں شعرا اور سامعین معقولیت کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ نہ صدر صاحب کو پرچی پہ پرچی بھیجی جاتی ہے نہ وہ شعرا اسٹیج کی زینت بنائے جاتے ہیں جو اس کے اہل ہی نہ ہوں۔ اچھے کلام کو سُنا جاتا ہے ہلکی چیز کو گوارا کر لیا جاتا ہے۔ متانت اور بالغ سنجی ہجولیوں کی طرح ہنستی کھیلتی نظر آتی ہیں۔

مشاعرہ ہرگز بُری چیز نہیں۔ مشاعرہ بازی بُری چیز ہے۔ خواہ یہ شعرا کی طرف سے ہو خواہ سامعین کی طرف سے۔ جس مشاعرے میں کسی معقول شاعر کو صرف اس لیۓ نہیں سُنا جاتا کہ اس کے گلے میں قدرتی لوچ نہیں اور وہ سُر تال کے ڈھنگ نہیں جانتا۔ اس مشاعرے سے نہ ادب کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے نہ اخلاق کو۔

خدا جانے یہ شعرا کے متعلق کہا ہے یا سامعین کے متعلق بہر حال ہمارے زندہ دل دوست نے خوب کہا ہے۔

ادب نوازی اہلِ ادب معاذ اللہ
مشاعروں میں اب احمق بُلائے جاتے ہیں

(۱۹۴۳)

لنچ ٹائم

"عدالت لنچ کے لیے برخاست ہوتی" ۔ بچپن میں کہیں یہ پڑھا' تو اپنے بڑوں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ دوپہر کے کھانے کا انگریزی یا مغربی نام لنچ ہے ۔ معلومات میں اضافہ ہوا تو خوش فہمی کو پر لگے ۔ ہم نے سوچا کہ دوپہر کے وقت عدالت میں جانے والے ہر شخص کو مختلف قسم کے لذیذ کھانے' پھل اور نہ جانے کیا کیا نعمتیں ملتی ہیں بس پھر کیا تھا ہم نے بھی ارادہ کر لیا کہ بڑے ہوں گے تو کسی عدالت میں ملازم ہو جائیں گے۔ مجسٹریٹ یا جج نہیں تو پیش کار سہی اور اگر یہ بھی نہ ہوئے تو اہلمد یا محرر بن جائیں گے۔ کبھی کبھی انقلاب زندہ باد کا نعرہ کانوں میں پڑتا یا کسی لیڈر کا جلوس دیکھتے تو سوچتے کہ وکیل بن جائیں گے لیکن اس قسم کے ہر تصور کے ساتھ عالم تخیل میں وہ خوان نعمت سامنے رہتا ۔ جس پر پلاؤ' زردہ' بریانی' حلوہ' انگور' سنگترے' سیب وغیرہ سلیقے سے چنے ہوئے ہوتے اور دوپہر کے وقت ہم "بنام جہاندار جان آفریں" اس پر پل پڑتے۔

لنچ اور لنچ ٹائم کا تصور ہمارے ذہن میں اپنے پوری دلا دینے یوں کے ساتھ ایک مدت

تک جما رہا۔

معلومات میں اور اضافہ ہوا تو خوش فہمی ہوا ہوئی۔ اور ہم سمجھے یہ سب بھرم ہی بھرم ہے۔ عدالت اس لئے برخاست نہیں ہوتی کہ واقعی لنچ کھایا جائے۔ بلکہ لنچ ٹائم منانے کے لیے برخاست ہوتی ہے۔ اور پھر لنچ ٹائم منانے کی سعادت بھی ہر کس و ناکس کا حصہ نہیں بنتی۔ چند صاحب یا صاحب نما افراد کو چھوڑ کر باقی سب لوگ اپنے اپنے رنگ میں شاعر کی طبع آزمائی کی طرح لنچ آزمائی کرتے ہیں۔ منشی، محرر، وکیل اور اس جنس کے دیگر لوگ جیب گرم کرنے کے داؤ پیچ لگاتے ہیں۔ توکل اور اس قسم کے سیدھے سادے لوگ لنچ ٹائم کے ظاہری اور باطنی اثرات سے بے خبر اپنی بے وقوفی اور دوسروں کی فریب کاری کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مغرب سے ہمیں کیا کچھ نہیں ملا۔ خالص مغربی لباس، خانساماں، بیرا اور آیا کی ایک خاص نسل۔ اتوار کی چھٹی۔ انگریزی تما ہندوستانی زبان اور ان سب پر مستزاد لنچ یا لنچ ٹائم۔ انفرادی یا وقتی ضرورت کے لیے اسے رواج دیا گیا اور اب یہ روایت بن گیا ہے۔ روایت کے خلاف جانا یا خلاف کہنا اس حد تک مناسب ہے کہ کوئی برا نہ مانے۔ اس لیے لنچ کی غریب الدیاری کا ڈھول پیٹنے کے ساتھ ساتھ ہمیں اس بات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے کہ کیا اس کی افادی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ اور دنیا میں وہ کون سی چیز ہے جس کی افادی حیثیت نہ ہو۔ زہر میں بھی زندگی بخش عناصر ہیں۔ چکا چوند کے عالم میں تاریکی فائدہ دیتی ہے۔ یہی حال لنچ ٹائم کا ہے۔ ذرا دفتروں میں "اہل قلم" یعنی کلرکوں کا حال دیکھئے کہ لنچ ٹائم کا انتظار کس بے قراری سے کرتے ہیں۔ محبوب کے انتظار کا عالم قدامت پسند شعراء کے لیے ایک دل خوش کن موضوع رہا ہے اور یہ

افسوس کہ ان کے مشاہدے ہیں وہی پرانا محبوب اور وہی انتظار کرنے والے پرانے عاشق ہی رہے۔ لیکن ان اگلے وقتوں کے لوگوں کا شکوہ ہی کیوں۔ شکایت تو زندگی کو نہایت قریب سے دیکھنے والے ان شعرائے جدید سے ہے جنھیں بے قراری کا یہ عالم نظر نہیں آیا۔ ورنہ ضرورت یا بے ضرورت کہیں نہ کہیں کہہ جاتے۔

ذکر اس صبح کا اے دوست نہ کر

جھلملاتی ہوئی منزل ہے جو فن کاروں کی

جس کے ارمان میں بے تاب ہے یہ دورِ جدید افکاری

لنچ ٹائم کے لئے جیسے کلرک

ذکر اس صبح کا اے دوست نہ کر

دفتر میں قریب قریب یہ روز کا واقعہ ہے کہ دوپہر کے وقت ایک بجا تو کوئی صاحب تشریف لائے اور فرمایا "کیوں بھائی اٹھو لنچ پر چلو گے" ذرا ان ستم ظریف حضرت سے کوئی پوچھے کہ بھائی آخر اس مذاق سے کیا حاصل۔ نہ خود کچھ کھاؤ اور نہ کسی کو کھلاؤ لیکن بڑی شان سے آکر کہہ ضرور دیتے ہو کہ لنچ پر چلو گے۔ اور پھر لنچ اگر واقعی لنچ نہیں تو کوئی چھکڑا ٹھیلا یا زیادہ سے زیادہ کوئی موٹر ہے کہ اس پر چلیں۔ ہمارے خیال میں تو یہ محض ایک خیالی گھوڑا ہے دوڑاؤ جہاں تک دوڑا سکتے ہو۔ اکبر الہ آبادی نے تو دلّی دربار دیکھا۔ اور ایک ایسی نظم کہہ دی کہ شہد کی مکھی سے ڈیوک آف کناٹ تک سب کچھ کہہ گئے۔ انھوں نے نہ جانے وہاں کیا کیا دیکھا لیڈی کرزن، دور کا جلوہ، آنکھیں میری باقی ان کا، سرکس، کھیل تماشے جمنا جی کا گھاٹ ایک اچھا خاصہ عجائب خانہ تیار کر دیا۔ آئیے ذرا لنچ ٹائم کا دربار دیکھئے وہاں

کیا نہیں ۔

کام کرنے والے دُھن کے پکّے اگر زیادہ نہیں تو تھوڑے بہت مل ہی جائیں گے جو پنچ ٹائم کے دیانتدارانہ مصرف سے واقف ہیں ۔ جب اُن کا پنچ ناشتے کے اوقات میں ہوتا ہو تو وہ اس دوپہر یا بعد دوپہر کی لعنت ہیں کیوں گرفتار ہوں ۔ وہ حق وانصاف کے پابند ٹھہرے ۔ وقت کی قدر انھیں ضرور ہے وقت ان کی قدر کرے نہ کرے لیکن کثرت ان اصحاب کی ملے گی جو لنچ ٹائم کو اس نظریے سے گزارتے ہیں کہ ؎

مُفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

دس بجے سیٹ پر آئے گیارہ تک گھر کی اور راستے کی کوفت مٹائی ۔ بارہ تک کام کی تیاری کی اور ایک بجے تک اپنے محبوب لنچ ٹائم کا انتظار کیا ۔ بھلا اتنی کاہش و کاوش کے بعد جو چیز میسر ہو اسے مُفت میں کون گنوائے ۔ اس کا تو صحیح مصرف ضرور ہونا چاہیئے خواہ کسی انداز سے ہو ۔ بعض کا یہ قول ہے کہ کھانا نہ سہی کچھ نہ کچھ کھایا ضرور جائے ۔ پھل، چائے، بسکٹ غرضیکہ ؎

جو ہاتھ آئے بس اس کو چٹ کیجے

ساتھی کی میز کی دراز میں سے کچھ ملے وہ اڑائیے ۔ کہیں سے ادھار ملے تو اس پر ہاتھ صاف کیجے ۔ آلو، چٹنی، دودھ، ٹماٹر، دہی، برفی، سنگترہ، چنے، امرود، مونگ پھلی غرض طبی فارمولوں، حفظانِ صحت کے اصُول، اور ڈاکٹروں کے مشوروں کو بالائے طاق رکھ کر جو جی میں آئے سو کھائیے ۔ بڑی مشقت کا کام ہے صاحب بے شکم پری کے ہو بھی کیسے سکتا ہے اور پھر لنچ ٹائم کا صحیح مصرف بھی پیش نظر ہے ۔ ٹفن روم کیا ہے، اچھا خاصا ریلوے اسٹیشن کا پلیٹ فارم ہے ۔ مسافر آتے ہیں جاتے ہیں

تازہ باسی سب بک جاتا ہے۔ پیالیاں ہیں، چمچے ہیں چینی نہیں تو نہ سہی۔ صاف پانی اور خالص دودھ بالکل غائب بورڈ پر مینو ہے کوئی دیکھے نہ دیکھے جو مانگو وہ نہیں ملتا، کچھ نہ کچھ ملنا ضرور ہے، انکار کی گنجائش نہیں، آزمائش شرط ہے نمک کم ہو یا زیادہ یہاں سب ہضم ہے۔ سودا زیادہ اُدھار بکتا ہے اور پوری باقاعدگی کے ساتھ۔ حساب میں اونے پونے یہاں کا روزمرّہ ہے۔ کوئی کھا پی کے چلتا بنے تو اس کی بھی گنجائش ہے۔ مغربی لباس والے کو ادھار بھی مل جاتا ہے مشرقی لباس والے کو نقد بھی مشکل سے ملتا ہے۔ یہ ہنگامہ ہاؤ ہو یوں تو آدھ گھنٹے میں ختم ہونا چاہیئے مگر گھنٹہ ڈیڑھ جاری ہی رہتا ہے کیونکہ آخر جلد اور دیر سے آنے والے ہر قسم کے مسافر کا خیال رکھا جاتا ہے۔ لنچ ٹائم میں اس منظر کو دیکھیں تو خدا کے رزّاق ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ اور سعدی کا یہ قول یاد آجاتا ہے۔

اگر روزی بہ دانش بر فزودے
زناداں تنگ تر روزی نہ بودے

اس دنیا میں اہل نظر کی اتنی ضرورت نہیں جتنی بے وقوفوں کی۔ عقل کے اندھے نہ ہوں تو اس دنیا میں کوئی جاذبیت اور کوئی دلچسپی نظر نہ آئے۔

سردیوں میں سرد نہیں تو گرمیوں میں گرم چائے بیچنے والوں کے اس قول کو کہ چائے سے تھکن دور ہوتی ہے وحی کا درجہ دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ لنچ ٹائم اصل میں ٹی ٹائم ہو گیا ہے۔ لیکن چائے پینے والے اور چائے بیچنے والے چائے کی ایسی مٹی پلید کرتے ہیں کہ باید و شاید۔ اس پر بھی اس گرم شربت کے پینے والے اس لحاظ سے قابل داد ہیں کہ وہ اس سے لطف اندوز ہوتے ہوتے خیّام اور حافظ کی قبر دل

پر لات مارتے ہیں اور بہ یک زباں فرماتے ہیں۔

جانِ شیریں کا قدر دان ہے وہی
تلخیٔ مے کا جو گلہ نہ کرے

جن نازک طبیعتوں پر ٹفن روم کی چہل پہل گراں گزرتی ہے وہ اپنی میز پہ ہی ٹفن کا رنگ جما لیتے ہیں۔ "بوائے" یا ملازم کو تھوڑی سی رشوت دے کر مہینہ بھر فراغت سے کھاتے اور پیتے ہیں۔ لنچ ٹائم میں سونے والے بھی ملیں گے۔ تاش کھیلنے والے بھی۔ گھر کا سودا سلف لانا، بنک سے لین دین، ڈاکخانے میں رجسٹری یا پارسل، دوسرے دفتروں میں تلاش ملازمت، لیڈروں کے درشن، اخبار پڑھنا جنے اکر ریڈیو کے لئے تقریریں لکھنے کا کام بھی لنچ ٹائم میں کیا جاتا ہے۔

نظام عالم میں موسم کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ مختلف اشیاء میں تبدیلی آتی ہے۔ پرندے موسم کے لحاظ سے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ پھل پھول ہوا پانی وغیرہ سب چیزوں میں تبدیلی ضروری ہے۔ دن رات بڑھتے گھٹتے ہیں لیکن اپنی جگہ پر استقلال سے جمنے والوں میں لنچ ٹائم کو ایک امتیازی شان حاصل ہے۔ نل کا پانی اور لوہے کی کرسی ایجاد کرنے والوں نے نہ جانے کیا حماقت کی کہ یہ دونوں چیزیں گرمیوں میں گرم اور سردیوں میں سرد ہوتی ہیں۔ لیکن لنچ ٹائم کے رواج دینے والوں نے کم از کم اس کے مصرف کے فوائد میں اتنی لچک بھر دی ہے کہ گرمی سردی کا احساس ہی نہ ہو سکے۔ اس کے لئے کوئی خاص قید نہیں۔ کوئی خاص نظام نہیں کوئی خاص قاعدہ نہیں۔ ہر مذہب و ملت کو یہ عزیز ہے رواداری سے اس کی نشو و نما ہے۔ بیماروں اور کمزوروں کے لئے سامان راحت، گھومنے پھرنے والوں کے لئے

گھومنے پھرنے کا موقع، شکم پروں کے لئے شکم پُری کی سہولت، کام کرنے والوں کے لئے کام اور کچھ نہ کرنے والوں کے لئے سستی اور سہل انگاری الغرض اس دنیا میں ہر مزاج اور ہر مذاق کے لئے کچھ نہ کچھ موجود ہے۔

عدالتوں اور دفتروں میں اس کا صحیح مصرف نہیں ہوتا نہ سہی یہ ایک مغربی افتاد ہے تو ہو مقصد اس سے تفریح ہے کام کرنے والوں کے لئے تفریح۔ نام اگر لنچ ٹائم ہے تو ہوا کرے۔ لنکا شائر کسی شاعر کا تخلص نہیں ہو سکتا۔ مارغا سکر کے دارالحکومت نے نانا ریو پر پکے گانے کے الاپ کا دھوکا نہیں ہو سکتا اور محض نام ہی پر جائیں تو دنیا میں جگہ جگہ دھوکا کھائیں۔ مرد اور عورت میں تمیز نہ کرسکیں اچھے اور بُرے کی جانچ نہ کرسکیں۔ لنچ ٹائم کا نام لنچ ٹائم رہے لیکن ہم یہی سمجھیں گے کہ یہ تفریح کا وقت ہے۔ نہایت محدود اور تفریح کی وسعتوں کے لحاظ سے بہت تھوڑا یہ وقت گزر تو جاتا ہی ہے لیکن بہتر یہی ہے کہ خوش اسلوبی سے گزر جائے۔ ورنہ بقول استاد ذوق ؎

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

کل اور آج

پوشاک

جب کسی مادر زاد ننگے مجذوب کو بے پروائی سے پھرتے دیکھتے ہیں تو خیال آتا ہے کہ قدرت شاید دورِ حاضر کے شوقِ جامہ زیبی پر ایک طنز فرما رہی ہے یا یہ کہ ہمارے آباد اجداد کی ابتدائی کیفیات کی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔ آدمی نے اپنی طویل عمر میں ارتقاء کی ہزاروں منزلیں طے کی ہیں اور زندگی کے ہر شعبے میں ایک تبدیلی کیا لاکھوں تبدیلیوں کو جنم دیا ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ عقل و دانش کی یہ کارفرمائی آخر کیا کیا رنگ لائے گی۔ کیونکہ ایٹمی طاقت کے نئے استعمال نے تو اس خیال کو اور تقویت بخش دی ہے کہ تہذیب حاضر اپنی جڑوں پر خود ہی کلہاڑا چلا رہی ہے لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ تیور کچھ اچھے نہیں۔ ہمیں یہاں ان باتوں سے بحث نہیں ہمیں تو دیکھنا ہے کہ آدمی نے روز اول سے اب تک اپنا تن ڈھانپنے کے لئے کیا کیا کوشش فرمائیں اور ان کوششوں کا ماحصل کیا ہے۔

تخلیق انسانی کے وقت کا صحیح یقین نہیں ہو سکا اور غالباً ہو بھی نہیں سکے گا

سچ پوچھیے تو ہونا بھی نہیں چاہیے۔ بعض راز ایسے ہیں کہ راز ہی رہنے کے قابل ہیں۔ اسی طرح ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ سب سے پہلے ابن آدم نے کونسا لباس فاخرہ ایجاد فرمایا ہوگا۔ درختوں کی چھال اور پتے ہی غالباً مشکل گشا ہوئے ہونگے اور انھیں یہ ظاہر کرنا ہے اور بھدّی چیزوں نے برہنگی کے خلاف آدمی کے جذبات کو قوت عطا کی ہوگی۔ لباس اور پوشش کی ایجاد آدمی کے اس احساس کی ترجمانی کرتی ہے جسے عرف عام میں شہوانیت کہا جاتا ہے۔ حیوان ناطق نے دوسرے حیوانوں پر اپنی فطری فوقیت کو ظاہر کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے اور اپنی برہنگی کو دور کرنے کی فکر میں ان چیزوں کا آسرا لیا جو انسان کا نہیں بلکہ نباتات کا قدرتی لباس تھا یہ تو تھی اس جذبے کی ابتدا اس کے بعد کا قصہ تو اتنا طولانی ہے کہ اسے تفصیل سے بیان کرنا بھی بہت مشکل ہے۔ پھر تو تن زیبی نے ایک باقاعدہ فن کی صورت اختیار کی اور نئے نئے ڈھنگ کے کپڑوں اور ان کی سلی ہوئی صورتوں کی ایجاد و اختراع ہوئی۔ اس ایجاد و اختراع میں ملک کی آب و ہوا وہاں کے باشندوں کے اوضاع و اطوار اور مزاج کو بڑا دخل تھا۔ کانوں میں کام کرنے والوں کا لباس اور ہوگا فوج میں لڑنے والوں کا اور شہر کی فضا میں عیش و عشرت میں غرق رہنے والوں کے لباس اور گاؤں میں محنت مشقت کی زندگی بسر کرنے والوں کے لباس میں بڑا فرق ہوگا۔ لیکن آپ جدھر بھی آنکھ اُٹھا کر دیکھیں گے ایک تبدیلی پائیں گے حیرت انگیز تبدیلی۔ کل جو رنگ نظر آتا تھا وہ آج نہیں اور آج جو صورت ہے شاید وہ کل تک نہ رہے۔ پرانے زمانے میں ڈھیلے ڈھالے اور سیدھے سادے کپڑوں سے آدمی اپنے جذبۂ تن پوشی کی تسکین کر لیتا تھا۔ تن ڈھانپنے کا خیال

زیادہ تھا۔ اور خوبصورت بننے کا کم۔ لیکن زمانے نے جب سے مادیت کی طرف قدم بڑھائے ہیں اسی رفتار سے خوبصورت بننے یا کم از کم خوبصورت معلوم ہونے کا شوق بھی ترقی پذیر رہا ہے۔ یہ جذبہ مرد اور عورت دونوں میں یکساں ہے۔

پُرانے زمانے کی مصوری کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ لباس میں نیم برہنگی کو دخل تھا۔ لیکن قرونِ وسطیٰ میں یہ نیم برہنگی غیر مہذب قرار دی گئی اور وجاہت و وقار کی خاطر لمبے لمبے سادے چغے ایجاد کئے گئے۔ سنگ تراشی کے پرانے نمونے جو ہندوستان یا ہندوستان سے باہر کے ملکوں میں پائے گئے ہیں پرانے زمانے کے لباس پر روشنی ڈالتے ہیں۔ موہنجو داڑو، ٹیکسلا، سانچی وغیرہ سے سنگ تراشی کے جو نمونے یا مجسّمے ملے ہیں ان سے بھی یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ عیسوی سن کے آغاز اور اس سے ہزار دو ہزار برس پہلے انسانی لباس کا مقصد محض انسانی جسم کے ان حصّوں کو چھپانا تھا جن کو عریاں رکھنا خلاف تہذیب و اخلاق سمجھا جاتا ہے۔ آج جسے آپ بداخلاقی سمجھتے ہیں کل وہی خوش اخلاقی بن جائے تو تعجب کا کوئی مقام نہیں ایک وقت تھا کہ لوگ برہنہ سر ہی رہتے تھے۔ پھر پتوں کے خول سر پر چڑھانے لگے جب جنگ و جدل کے سامان پیدا ہوئے اور انسان میں ملک گیری کی ہوس پیدا ہوئی تو لوہے کے خود بن گئے۔ اس کے بعد تعیّش اور وجاہت کا زمانہ آیا۔ دستار اور ٹوپی ایجاد ہوئی۔ اہل علم و فضل نے اس میں بھی مشرقی شاعری کی طرح مبالغے سے کام لیا اور اتنی بڑی بڑی پگڑیاں سر پہ لپیٹیں کہ آج کوئی دیکھے تو ہنسی کو ضبط نہ کر سکے۔ پگڑی میں بھی نفاست آفرینی نے اپنی گل کاریاں کیں۔ بادشاہوں، فوج کے سپہ سالاروں، رئیسوں اور درباریوں نے ایجاد کی اس تصویر میں ہزاروں

رنگ بھرے۔ ہر ملک ہر صوبے اور ہر خطّے نے اپنی ضروریات موسم کے مطابق اسے ایجاد کیا۔ اپنے مزاج کے مطابق اس کے پیچوں کو ترتیب دیا۔ ہندوستان میں راجپوت مرہٹے حیدرآبادی مدراسی مارواڑی پگڑی جداگانہ شان سے لباس کا طرۂ امتیاز بنی۔ ہندوستان سے باہر افغانستان، ایران اور عرب ملکوں میں بھی اس کا اقتدار رہا انسان میں تنوّع پسندی کا جذبہ فطری ہے۔ پگڑی سے ٹوپی پر اتر آیا اور ٹوپی کی اتنی طرزیں ایجاد کیں کہ نام گنتا بھی ممکن نہیں۔ ہندوستان کو ہی لیجئے انگریزی ٹوپی آخر اس ملک کی پیداوار بھی نہیں اور نہ یہاں کی آب وہوا کے مطابق ہی ہے یہ تو محض بدیسی حاکموں کی چند نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے جو ابھی آہستہ آہستہ مٹے گی لیکن رام پور کی مخملی، لکھنؤ کی دوپلّی، گجرات کی گول اور نہ جانے کون کون سی ٹوپیاں ہندوستان میں پیدا ہوئیں اور ہوتی چلی جارہی ہیں۔ سیاسی حالات بھی لباس کی تبدیلیوں کے ذمہ دار ہیں۔ ٹوپیوں میں اب سب سے مقبول اور قابل احترام گاندھی ٹوپی ہو گئی ہے۔ ہندوستان کے وزیر اعظم سے لے کر ایک ادنےٰ مزدور کے سر کو زیب دینے والی یہ گاندھی ٹوپی ہی ہے۔ گاندھی جی نے تو شاید یہ ٹوپی کبھی استعمال ہی نہ کی ہو لیکن یہ ان کے نام سے منسوب ضرور ہو گئی۔ سنہ ۱۹۲۰ء ۱۹۲۱ء کا زمانہ تھا ترک موالات کی تحریک زوروں پر تھی۔ ہمیں یاد ہے کہ اس ٹوپی کو اُس زمانے میں اتنی مقبولیت ہوئی کہ آج یہ ہمارے لباس کا ایک جزو خاص بن گئی ہے اور شاید ہمیشہ کے لئے نہیں تو ایک مدّت کے لئے بنی رہے۔ بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ کی تحریک زوروں پر تھی۔ والہانہ انداز سے لوگ ململ کی پگڑیاں اتار کر آگ کی نذر کرتے نظر آتے تھے۔ گاندھی ٹوپی ململ کی پگڑیوں اور دوسری ٹوپیوں کا نعم البدل ثابت

ہوئی - لالہ لاجپت رائے اور پنڈت موتی لال جیسے پرانے بزرگوں نے اس ٹوپی کو اپنایا اور اب تو کبھی کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کا اجلاس دیکھیں تو یہ ٹوپی کانگرس پارٹی کے لباس کا جزو خاص نظر آتی ہے - اب جب کہ ملک آزاد ہو چکا ہے - مغربی لباس کی طرف بڑھتا ہوا رحجان کم ہو رہا ہے - اور خوش پوش نوجوان گاندھی ٹوپی پہننے کی دھن میں کوٹ پتلون اور ٹائی کو خیرباد کہہ رہے ہیں - وہ بھی زمانہ تھا کہ ننگے سر پھرنا امر کانشان سمجھا جاتا تھا لیکن دستار و کلاہ دور حاضر میں بہت سروں سے غائب ہوگئی اور برہنہ سری فیشن نہیں بلکہ روزمرہ کا عام دستور بن گئی -

یہ تو تھا سر کے لباس کا ذکر کل کیا تھا اور آج کیا ہے - باقی لباس میں بھی آپ ایک نمایاں تبدیلی دیکھیں گے - معمولی جھوٹے جھولے اور انگرکھوں میں تبدیل ہوگئے - چغے اور انگرکھے چست کوٹ بن گئے - کھلے پاجامے اور ڈھیلی ڈھالی دھوتی کی جگہ پتلون نے لے لی - زندگی کی تگ و دو کے ساتھ ساتھ لباس بھی چست ہوتا گیا اور جس رفتار سے زندگی کے ہر شعبے میں موشگافیاں ہوئیں اسی رفتار سے درزی میاں نے بھی اپنے فن کو سائنٹفک رنگ میں رنگ دیا - حضرت خیاط ٹیلر ماسٹر بن گئے - ذرا اور بلندی پر پہنچے تو کئی شاخیں ہوگئیں - کٹر، اوٹ فیٹر اور نہ جانے کیا کیا - دنیا میں رفتار کی ترقی نے جہاں بہت سی آسانیاں بہم پہنچائی ہیں وہاں زندگی کو نہایت پیچیدہ اور دشوار بھی بنا دیا ہے - ایک دن میں آپ دنیا کے اِس گوشے سے اُس گوشے تک سفر کرنے کے قابل ہو گئے ہیں تو پھر یہاں کی دیکھی ہوئی چیز وہاں کیوں نہیں بنانی چاہیئے - لباس بھی ایک عالم گیر معیار کیوں نہ اختیار کرلے - فرانس کا لباس راجپوتانہ میں کیوں دخل پذیر نہ ہو اور انگلستان

یا امریکہ کا لباس بنگال میں پسندیدگی کی نظر سے کیوں نہ دیکھا جائے - بہرحال نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ جنگ زرگری کے ساتھ ساتھ دنیا میں تنوع پسندی اور ذہنی اضطراب کا بھی دور دورہ ہے - اس کا اثر زندگی کے ہر شعبے پر پڑ رہا ہے - لباس اس سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا- سب سے زیادہ مقبولیت اس دور میں یورپی لباس کو ہوئی ہے - اول تو مغربی ملک حکومت کی اجارہ داری کے طفیل دنیا کے تمدن اور طرز زندگی پر پوری طرح اثر انداز ہوتے ہیں دوسرے ان کے لباس میں خاص جاذبیت بھی ہے - لیکن سرد ملکوں کا لباس گرم اور گرم مرطوب آب وہوا والے ملکوں میں کہاں تک کام دے سکتا ہے اس کا فیصلہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں جو لوگ سردیوں میں انگریزی سوٹ پہنتے ہیں گرمیوں میں ململ کے کرتے اور دھوتی کا سہارا لیتے ہیں -

مقصد اس تفصیل سے یہی ہے کہ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ لباس میں بھی تبدیلی آتی رہی ہے - عام رجحان یہی ہے کہ تن پوشی محض تن پوشی نہیں رہی بلکہ جامہ زیبی بن گئی ہے - آج پچاس ساٹھ برس پہلے کے رئیس کے لباس کا تصوّر کیجیے اور آج کل کے ایک باوقار امیر کا تصور کیجیے جسے دن بھر موٹر میں گھومنا پڑتا ہے - اپنے کاروبار یا کام کی نگرانی بھی کرنی پڑتی ہے اور پھر تفریح گاہوں اور دوسری جگہوں میں بھی ان لوگوں کی صحبت میں بیٹھنا پڑتا ہے جو خالص مغربی وضع رکھتے ہیں کہاں وہ زرد بانات کا گنبیلا جوتا، گوٹ دار غرارہ اس پر انگرکھا اور چوگوشیہ ٹوپی اور کہاں آج کل کی خالص مغربی وضع - زمین آسمان کا فرق ہے لیکن اسے بھی بدلتے دیر نہیں لگے گی - اب تو چپّل، کرتا اور دھوتی اپنا رنگ جما رہے

ہیں زیادہ تکلف برتا جائے تو چوڑی دار پاجامہ قمیض اچکن یا شیروانی اور سر پر گاندھی ٹوپی۔ یہ تو تھا ذکر خیر مردوں کے لباس کا۔ اب عورتوں کے لباس کے باب میں سنئیے۔ عورت کا لباس اوّل اوّل تن پوشی تک محدود تھا لیکن اس کے بعد جامہ زیبی کی حدود میں داخل ہوا تو یہ کوشش بھی شروع ہوئی کہ اس میں جاذبیت ہو۔ آرائش حسن ایک فطری جذبہ ہے اور لباس اس آرائش کا ایک ضروری حصہ ہے لیکن آرائش محض ایک اضافی بات ہے۔ ایک ملک میں جس چیز کو عورت کا حسن سمجھا جاتا ہے ضروری نہیں کہ دوسرے ملک میں بھی اسے حسن سمجھا جائے۔

آج سے تھوڑی مدت پہلے ہمارے ملک میں عورتوں کی تعلیم سرے سے مفقود تھی۔ جب عورت محض گھر کی چاردیواری میں قید رکھے جانے کے ہی قابل سمجھی جاتی تھی۔ اس کا لباس بھی وہی دقیانوسی قسم کا تھا۔ کہیں کھلا اور کہیں تنگ پاجامہ ڈھیلا کرتا اور گھونگھٹ کی غرض سے ایک دوپٹہ۔ پردے کی رسم عام تھی اور پردہ لباس کی نوعیت پر پورے طور سے اثر انداز تھا۔ ملک میں تعلیم آئی۔ عورتوں کی ترقی کے لئے تحریکیں شروع ہوئیں تو لباس کی قدامت بھی اڑنے لگی۔ آج جو تصویر ہندوستانی عورت کی ہمارے سامنے ہے وہ ایک خوف زدہ انجان اور جاہل عورت کی تصویر نہیں بلکہ آج اس میں زندگی کی جھلک ہے۔ مردوں کے ..... دوش بدوش زندگی کے فرائض ادا کرنے کی دھن ہے۔ ساڑی نے اس کے حسن کو دوبالا کیا ہے۔ اسے ایک قسم کا وقار اور تمکنت بخشی ہے۔ ساڑی، شلوار، قمیض، دوپٹہ اپنے اپنے انداز میں جسم کی زینت بن رہے ہیں۔ اعضاء کے تناسب کو نمایاں کرنے کی کوشش ارادی یا غیر ارادی طور پر ہو رہی ہے لیکن اس کا مطلب

اس کے سوا کچھ نہیں کہ صحیح شعور اب ان والہانہ باتوں کی کھلی اجازت دیتا ہے اور اس بات کی تلقین نہیں کرتا کہ اپنے جسم کی خوبصورتی یا اس کے قوس اور خطوط کو اتنا چھپاؤ کہ کسی ناقد حسن و شباب سے داد بھی نہ لے سکو۔

قدامت پسند کہتے ہیں کہ بے غیرتی کی انتہا ہو رہی ہے اور ادھر سے یہ جواب ملتا ہے کہ آخر یہ جہالت کب تک۔ عورت بھی تو چستی اور طرّاری کی آرزومند ہے وہ گھوڑے کی سواری کرنا اور موٹر چلانا چاہتی ہے فوج میں لڑنے کی آرزومند ہے فیکٹری کا انتظام سنبھالنے کے درپے ہے۔ پھر کیوں اس پر یہ پابندیاں عائد کی جائیں کہ وہ گھونگھٹ میں چہرے کو چھپائے رکھے۔

اس دور میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ آنے والے دور کا پیش خیمہ ہے لیکن ہم ضرور کہہ سکتے ہیں کہ لباس ہر صورت میں انسانی ضروریات سے اثر پذیر ہو رہا ہے اگر انسانی ضروریات اور انسانی تگ و دو کا نتیجہ یہی نکلا کہ قدرت کا راز بھی ظاہر ہوا اور رسوائی بھی تو ہمیں یہی کہنا پڑے گا۔ ع

ہم اپنے شوق تن زیبی میں عریاں ہوتے جاتے ہیں

۱۹۴۷

"اس تیوہار پر یہ تو کرنا تھا"

پاگلوں کے گاؤں میں کہیں ایک ہاتھی آگیا۔ گاؤں کے سب لوگ ایک پڑھے لکھے پاگل کے پاس گئے اور پوچھا کہ یہ کیا بلا ہے۔ اس نے بڑے غور کے بعد کہا کہ یہ کوئی بلا نہیں۔ کالی رات سمٹ سمٹا کر بیٹھی ہے۔ دن ختم ہونے دو یہی پھیل کر فضا پر چھا جائے گی اور چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آئے گا۔ کسی نے زندگی کی بالکل اسی قسم کی تعریف کی ہے۔ یعنی زندگی کیا ہے "پریشانیوں کا مجموعہ" ہے۔ دنیا بھر کی پریشانیاں جمع کر لو تو زندگی کا روپ دیکھ لو۔ یہ تعریف یوں تو عقلمندوں نے کی ہے لیکن غور سے دیکھیں تو یہ بھی مجذوب کی بڑ کے سوا کچھ نہیں۔ پریشانیاں زندگی کا ضروری حصّہ ہیں بلکہ ایک ایسا حصّہ جن کے بغیر زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس لئے پریشانیوں کو پریشانیاں کہنا ہی غلط ہے یہ تو اپنے اپنے احساس کی بات ہے۔ چھوٹے بڑے واقعات انسان کی عادتیں یا روزمرہ کا معمول اگر پریشانیاں ہیں تو اس کم سمجھی کا کیا علاج۔ اس بحث سے تو خیر ہمیں مطلب نہیں۔ آئیے ذرا ان حضرات کی بوکھلاہٹ یا اضطراب کا ملاحظہ کیجیے جو ہر تیوہار کو منانے کے لئے بے تاب رہتے ہیں اور منانے کے بعد ہمیشہ

یہ محسوس کرتے ہیں کہ فلاں کمی رہ گئی فلاں بات بھول گئے اور فلاں ضروری فرض ادا نہ کیا جا سکا۔ فارسی میں ایک مثل ہے کہ جو مکا لڑائی کے بعد یاد آئے اسے اپنے منہ پر مار لینا چاہیے بالکل یہی صورت ان حضرات کی ہے جو وقت گزر جانے کے بعد اپنی فروگذاشتوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

ابھی تھوڑے ہی دن گزرے ہیں ملک میں ہولی کا تیوہار منایا گیا۔ گلال چھڑکا گیا رہگیروں کے منہ رنگے گئے، کپڑے بھگوئے گئے۔ ایسے ایسے رنگ چھڑکے گئے کہ اتارے نہ اتر سکیں۔ رنگ رلیاں، باجا، ڈھولک، گیت، دیواریں پھاندنا، چھتوں پر دوڑنا الغرض کیا کیا اودھم نہ مچائے گئے۔ چوک اور ہر موڑ پر ہولی جلائی گئی۔ لوچن کیا گیا، دھوئیں کے رخ کو دیکھ کر اچھی اور بری فال دیکھی گئی۔ توہمات کی داستانیں سنائی گئیں، پکوان پکے، جی بھر کے کھائے گئے۔ کسی کو بدہضمی کی شکایت ہوتی کسی کو کم خوری کا شکوہ رہا لیکن اس کے باوجود جس کو پوچھو کچھ نہ کچھ کسر باقی رہی۔ کسی کو یہ شکوہ ہے کہ فلاں دوست، فلاں رشتے دار کو نہ بلا سکے اور کسی کو رنگ اچھا نہ مل سکا۔ کسی کے بچوں کی خوشی پوری نہ ہو سکی۔ پچکاری بھی خرید کر لائے لیکن نکلی بالکل ناقص۔ دن بھر کپڑے اور دھاگے سے پچکاری کا پسٹن باندھا کئے لیکن اسے نہ چلنا تھا نہ چلی۔ بچے بسور کر رہ گئے پچھلے سال بھی ایسا ہی ہوا تھا اور اس وقت یہ تہیہ کیا تھا کہ اب کے ہولی پر ایسی پچکاری لائیں گے جو آسانی سے چلے بچے پچکاری بھر کر ماں باپ پر چلائیں۔ سال بھر کون ان باتوں کو یاد رکھتا ہے سال کے بعد وہی غلطی پھر سرزد ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہمسائے رنگ کی بالٹیاں بھر کر ہمارے صحن میں آ کودے اور تقاضا کیا کہ ہم باہر نکل کر ہولی کھیلیں۔ بہت

سی مقدس ہستیوں کے نام کے ساتھ یہ تہوار وابستہ ہے جو نہیں کھیلتا وہ مردہ دل ہے۔ تقاضائے فطرت کو نہیں سمجھتا۔ موسموں کے اتصال کے معنی نہیں سمجھتا۔ بہرحال جب ہم نے ان کے پاس خاطر سے ہتھیار ڈال دئے تو خوش ہو ئے۔ کپڑے رنگ سے آلودہ کر کے ہاتھ پاؤں منہ اور سر کے بالوں تک کو مضحکہ خیز سا بنا کر چل دئے لیکن ابھی کل ہی کی بات ہے کہ نہایت اطمینان سے فرمانے لگے "اب کے تو خیر جو ہوا سو ہوا اگلے برس اگر زندہ رہے تو وہ رنگ تیار کریں گے جو کسی سائنس یا کیمیائی عمل سے بھی نہ اُتر سکے دراصل رنگ بنانے میں کسر رہ گئی اور سچ پوچھئے تو اب کے ہولی کا مزہ نہیں آیا۔ یار دوستوں کو جمع کرتے کچھ شعر و نغمے کا دور ہوتا۔ ہوسکتا تو رقص بھی ہوتا۔ خوب دھما چوکڑی مچاتے اس کے بعد دعوت اڑتی وغیرہ وغیرہ۔

ہم نے سوچا مرغی جان سے گئی کھانے والے کو مزہ نہ آیا۔ خوب ہیں یہ حضرت کہ اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی ابھی ان کا خیال ہے کہ کچھ کسر رہ گئی کسر ہی نہیں بلکہ مزے سے ہولی ہی نہ منائی جا سکی اب بتائیے کہ ایسے بزخود غلط لوگوں کا کیا علاج پھر اس پر اکتفا نہیں کہ بات کی اور ہوا میں اڑ گئی۔ سچ مچ ان باتوں کو جی جان کا روگ بنا لیتے ہیں کفِ افسوس ملتے ہیں آئندہ ارادوں کا پروگرام مرتب کرتے ہیں کسی کی بات سُننا بھی حرام سمجھتے ہیں۔ فرما رہے تھے کہ رنگوں کی آمیزش کا باقاعدہ مطالعہ کیا جائے گا۔ اس مضمون پر اچھی خاصی ریسرچ کے ارادے ہیں۔ سچ ہے کالج میں تو زیادہ انہماک سے تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ اب نئے موضوع مل گئے ہیں ہم سوچتے ہیں کہ ہولی نہ ہوئی ان کے لیئے ایک مصیبت ہوئی۔ کتنے دن انھوں نے انتظار میں گزارے۔ کیا کیا سامان کئے گئے۔ گھروں کی درمیانی دیوار کی بلندی

ناپائی گئی - اسے پھاندنے کے طریقے سوچے گئے - اپنی طاقت کا اندازہ لگایا گیا اور پھر اس پر بھی بچّوں میں سے کسی کا سہارا بھی لیا گیا لیکن مزہ نہیں آیا آں جناب کو۔ ایک ہولی پر کیا موقوف ہے - یہ لال بجھکڑ قسم کے ہمسائے جنھیں آج تک بابوجی کے سوا ہم نے اور کچھ کہا ہی نہیں ہر تیوہار پر اسی قسم کے راگ الاپتے ہیں - ان کا کوئی تیوہار کبھی پورے طور پر نہیں منایا گیا - کہیا گہری ایک آنچ کی کسر ان کے ہر تیوہار میں موجود رہتی ہے -

ہولی کا ایک اور واقعہ سنئیے - بازار میں ایک چوراہے پر ہولی جلائی گئی - آٹھ دس من سے بھی زیادہ ایندھن ہوگا - تیز ہوا چل رہی تھی آگ کے شعلے بلند ہوتے تو ایک چنگاری نے قریب ہی پھوس کے ایک چھپر کو نذرِ آتش کر دیا - چاروں طرف لوگ پانی کی بالٹیاں لے کر بھاگے - فائر بریگیڈ بھی بلوایا گیا - خیر گزری کہ آگ زیادہ نہ پھیلی ورنہ اور دوکانوں اور مکانوں کو بھی لگ جاتی تو تیز ہوا میں آگ کو قابو میں لانا مشکل ہو جاتا - یہ واقعہ ہو چکنے کے بعد بھی ہجوم میں ایک شخص نہایت حسرت بھرے انداز میں کہہ رہا تھا کہ صاحب ہولی اب کے پوری شان سے نہیں جلائی گئی - ایندھن کم تھا ہولی بھی جبھی کم رہی - آئندہ سال بیس من سے کم لکڑی نہ ڈالی جائے - چالیس پچاس برس پہلے تو سو سو من ایندھن راتوں رات ختم کر دیا جاتا تھا - بزرگوں کی باتیں تو ان کے ساتھ گئیں - اب ان کا مقابلہ ہی کون کر سکتا ہے - ان میں سَت بھی تھا اور وہ زمانے بھی اچھے تھے لیکن اب بھی ہم گئے گزرے تو نہیں اگر سو من نہیں بیس پچیس من ایندھن تو خیر جلا ہی سکتے ہیں - ان حضرت سے پوچھئے کہ آٹھ دس من ایندھن ہی جلایا تھا کہ بازار جلنے سے بچ رہا - بیس تیس یا پچاس من تک نوبت

پہنچی تو انجام نہ جانے کیا ہو گا۔

پچھلی دیوالی کا ذکر ہے۔ پڑوس میں ایک دوست رہتے ہیں۔ صبح کو ہمارے یہاں تشریف لے آئے۔ فرمانے لگے کتنا بڑا تیوہار ہے اور چھٹیاں صرف دو۔ دیوالی تو تمام تیوہاروں کا سنگار ہے۔ اماوس کی کالی رات اور چراغاں کا عالم کتنا حسین منظر پیش کرتا ہے۔ نہ جانے کتنی صدیاں گزر گئیں یہ تیوہار اسی شان اور اہتمام سے منایا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک ہمارا خیال ہے مکمل طور پر ایک بار بھی نہیں منایا جاسکا۔ مٹھائی بنتی ہے بکتی ہے۔ تھالوں کے تھال خالی ہوتے ہیں لیکن صاحب اس میں بھی کوئی نہ کوئی کسر باقی رہتی ہے۔ خیر ایسی تقریریں سننا تو ہمارا روز کا معمول ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ حضرت نے ہمیں دعوت بھی دے دی۔ بہت ٹالا۔ بیسوں حیلے بہانے کیے۔ آج یہ کام ہے آج وہاں جانا ہے ان حضرات کا انتظار ہے بیوی کی فلاں فرمائش خریدنا ہے اور پھر بچوں کی ضد، کاغذی فانوس خریدنا ہے۔ پٹاخے پھرچھڑے، انار اور ہلکی آتش بازی غرض بہت سا سامان لانا ہے لیکن وہ نہ مانے اور مان نہ مان میں تیرا میزبان کے مصداق زبردستی کے میزبان بن گئے۔ تیوہار کا دن تھا ہر گھر میں مصروفیت کا عالم تھا۔ بیوی بچے تو اپنے اپنے شغل میں مصروف رہے۔ ہم چار بجے کے قریب چلے گئے۔ عجب عالم تھا بیوی خاوند میں عملی طور پر تو نہیں لفظی جوتا چل رہا تھا۔ ایک کا اعتراض تھا کہ آج دوستوں کو دعوت دینے کا کون سا دن ہے دوسرے کا ڈیفنس صاف تھا کہ اگر دوست بھی نہ آئیں تو تیوہار ہی کیا ہوا۔ بیوی اور خاوند میں جب ہمیں باعث نزاع ٹھہرے تو وہاں ٹھہرنا ہمیں دوبھر ہو گیا۔ بارے کچھ سکون ہوا تو ہم نے مداخلت کی اور کہا کہ کون سی بحث طلب بات تھی کہ آپ لوگوں نے

آسمان سر پر اٹھا لیا۔ یہاں سوائے ہمارے اور کون ہے اور ہم کو دوستوں یا دشمنوں میں شمار کیا آپ لوگوں نے۔ بھائی ہم تو پڑوسی بھی ہیں اور پھر آپ ہیں اور ہم ہیں تو گھر کی سی بات ہے ہم کوئی غیر نہیں آپ کوئی دوسرے نہیں معاملہ واحد ہے۔ یہ دوست دشمن کی بحث کیا شروع ہو گئی تھی۔ کان کھائے آپ لوگوں نے، لیجئے ہم چلتے ہیں۔ لیکن آنے کون دیتا۔ بیوی سر ہو گئی اور کہنے لگی "بھائی صاحب آپ کا ذکر کس نے کیا یہ تو دوسروں کی بات تھی۔ دوسروں کی جن کو لا کر یہاں جمع کرنا چاہتے تھے ہمارے سر پر بٹھانا چاہتے تھے۔ آج تیوہار کا دن ہے ہمیں بھی تو کچھ فرصت چاہئے کچھ وقت چاہئے۔ کسی کے گھر پر چیز بھیجیں۔ کسی کو ہاں سے آئے تو اسے سنبھالیں۔ اب انھیں سے پوچھئے کہ کیا کیا ضروری باتیں رہ گئی ہیں۔ دیئے آ گئے لیکن روئی ابھی تک نہیں آئی۔ اب کیسے جلیں گے یہ دیئے۔ نئے لحاف میں سے روئی نکالوں گی۔ ان کا کیا جاتا ہے۔ گھر تو ہمارا لٹتا ہے۔ اچھا یہ بھی چھوڑو۔ سال بھر کہتے رہے کہ جلیبی اب کے گھر پر پکائیں گے۔ نہ کوئی سامان تیار کیا اور نہ میدہ تک بازار سے لائے۔ جب کہا تو فوراً کہہ دیا کہ کہاں سے لاؤں راشن کا زمانہ اور پھر خلاف قانون بات کروں تو سوسائٹی کا بھی مجرم، ملک کے قانون کا بھی مجرم۔ پکڑا گیا تو سزا پاؤں گا اب آپ ہی دیکھئے کہ قصور کس کا ہے۔ جلیبی بھی نہ پک سکی۔ یہ تو کہتے ہیں ہاتھ پر سرسوں جما دی جائے۔ تیوہار کا دن کوئی روز روز تو آتا نہیں۔ سال بھر کے بعد جس کے اچھے نصیب ہوں اسے یہ دن دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔ بیاہ شادی تو مجبوری کی باتیں ہیں۔ روتے پیٹتے یہ رسمیں آدمی کو پورا کرنا ہی پڑتی ہیں لیکن تیوہار تو خالص خوشی کا موقع ہوتے ہیں۔ پھر بھی ان کو کبھی کوئی تیوہار پورا مناتے نہیں دیکھا جنم اشٹمی

کے دن تو یہ برت نہیں رکھ سکتے ۔ پوجا کے وقت کبھی چندن نہیں ہوگا ۔ کبھی پھول نہیں ہونگے ۔ الغرض کوئی نہ کوئی کمی باقی رہ جاتی ہے ۔ ساون میں تیجوں کے دن آئیں تو انہیں کبھی خیال بھی نہیں آتا کہ کیا کرنا ہے اور کیا خرید کے لانا ہے ۔ بھاڑ میں جائیں تیوہار اس لمبی تقریر کو قطع کرتے ہوئے ہمارے کرم فرما بول اُٹھے ۔ ”اجی بس رہنے دو اس لیکچر کو ساری دنیا کے تیوہاروں کا ٹھیکہ شاید تمہیں نے لے رکھا ہے ۔ تمہارا تو کبھی پیٹ ہی نہیں بھرتا مزاج ہی ایشور نے ایسا دیا ہے کہ ہر وقت پتی کو کوستی رہو ۔ بھلا چڑچڑے مزاج کے ساتھ بھی تیوہار منائے جاتے ہیں ۔ جو استری پتی کو خوش نہ کر سکے وہ اپنے ایشور کو کس طرح خوش کر سکے گی“ ۔

بہر حال اس طویل بحث کے ختم ہونے سے پیشتر ہی ہم وہاں سے آگئے ۔ ہم نے دیکھا فلاں چیز نہیں تو جھگڑا اور فلاں بات نہیں تو جنگ عجب خبط ہے تیوہار نہ ہوئے ایک پریشانی ہوئی اور پریشانی بھی ایسی کہ جزو زندگی بن جائے ۔

دوسرے ملکوں میں بھی یہ بیماری پائی جاتی ہے اور اس کے جراثیم اتنے عالم گیر ہیں کہ دنیا کا کوئی گوشہ اس سے بچ نہیں سکا ۔ کرسمس ہی کو لیجئے ۔ کیا کیا اہتمام کئے جاتے ہیں ۔ مہینوں پہلے نئے سال کے کرسمس کارڈ دنیا کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک پہنچتے ہیں ۔ بچّوں کے لئے کھلونے بڑوں کے لئے تحفے ۔ الغرض مذہبی اور غیر مذہبی انداز سے یہ دن منایا جاتا ہے ۔ پھر بھی کچھ لوگ ایسے ضرور ملیں گے جو یہ کہیں گے کہ بڑی بھول ہوئی ۔ وہ کھلونا چھوٹے بچے کو لاکر دیتے ۔ وہ خاص مٹھائی خرید کر لاتے ۔ فلاں کتاب فلاں اخبار لاتے وہ تماشے وہ کھیل دیکھنے وغیرہ وغیرہ دنیائے اسلام میں عید منائی جاتی ہے ۔ کس بے تابی سے اس کا انتظار کیا جاتا ہے

عید کا ایک دن آخر گزر ہی جاتا ہے۔ اس ایک دن کے بعد کتنی حسرتیں کتنے ارمان باقی رہ جاتے ہیں۔ اور آئندہ سال کے لیے پھر ایک لائحہ عمل ذہن میں رہ جاتا ہے لیکن انسان کے ارادے کبھی پورے طور پر شرمندۂ تکمیل نہیں ہو پاتے۔ انسان مجبور ہے۔ اس کے سب کام مجبوری کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ اس لیے اگر بات نامکمل رہتی ہے تو اس کا قصور نہیں۔ قصور البتہ اس انداز فکر کا ہے جو اسے قصوروار ٹھہراتا ہے۔ جہاں خبطی اور سنکی آدمیوں کی اور باتیں دوسروں کو خوش مذاقی کا سامان بہم پہنچاتی ہیں وہاں اس قبیل کے تیرہ ہاری کرم فرماؤں کی باتیں بھی کچھ کم موجب تفریح نہیں ہیں۔ زندگی کی پریشانیوں کو پریشانیاں نہ سمجھنا ہی پریشانیوں سے رہائی کا بہترین ذریعہ ہے اور اس پر ہمارا عمل ہے۔ اب رہی آپ کی بات اسے ہم آپ پر چھوڑتے ہیں۔

پگڑی

اکبر الہ آبادی نے ڈارون کے نظریہ ارتقاء کا مضحکہ اڑایا اور فرمایا۔

کہا منصور نے خدا ہوں میں ڈارون بولا بوزنا ہوں میں

لیکن اس کے باوجود ڈارون کا یہ قول کہ ہر نوع کی ساخت اور طرز زندگی کی تشکیل اس کا ماحول کرتا ہے ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پگڑی یا صافے کا وجود بھی ماحول کے مطابق طرز زندگی یا طرز لباس کی از خود تشکیل کا آئینہ دار ہے یہ کہنا تو مشکل ہے کہ پگڑی کب وجود میں آئی لیکن کم و بیش ایک ہزار سال پہلے فارسی شاعری اور قدیم مصوری کے نمونے اس کی ہستی کا اعتراف کرتے ہیں۔ اسے گمان غالب کہئے یا قیاس واثق لیکن سمجھ میں یہی آتا ہے کہ اس کی تاریخ اس قدر پرانی ہے جس قدر انسان کی برہنگی سے بچنے کی کوشش یا صاف لفظوں میں تن پوشی کی خواہش کے ساتھ ساتھ لباس کی ایجاد و اختراع۔ سر انسانی جسم کا ایک محفوظ ترین مگر ضروری حصہ ہے موسم کی تندی یا ہم جنس دشمن کے وار سے بچنے کے لئے تن ڈھکنے کے ساتھ ساتھ سر ڈھکنے کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہوگی۔ سر ڈھکنے کی یہ کوشش پتوں کے خول سے

ہے کہ زمانۂ حال کی خوش وضع ٹوپی تک بہت سی منزلیں طے کر چکی ہے۔ اس طویل سفر کی کسی درمیانی منزل کا نام ہے پگڑی یا صافہ۔ دستار کہہ لیجیے یا عمامہ، پٹکا کہیے یا سر پیچ۔

ہندوستان میں پگڑی ایک خاص عظمت کی حامل رہی ہے۔ اسے آب وہوا کا اثر کہیے یا کپڑے کی فراوانی کہ ہندوستان میں یہ پیدا ہوئی اور پروان چڑھی۔ راجاؤں نے اسے سر پر بٹھایا۔ عوام نے اس کا بوجھ سہا۔ دربار دل میں اسے عزت ملی محبت اور اخلاص کی دنیا میں دستار بدل بھائی کا رشتہ پیدا ہوا۔ اس کا سر پہ نہ ہونا ماتم کا نشان قرار دیا گیا۔ کلغی اس پہ سجی۔ سہرا اس پہ بندھا۔ چنانچہ استاد ذوق نے شہزادہ جواں بخت کا سہرا لکھ کر فرمایا۔

ایک کو ایک پہ تزئین ہے دم آرائش

سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

الغرض ہمارے معاشرتی نظام میں اس نے ایک خاص اہمیت پائی ایک خاص رتبہ پایا۔ صرف ہندوستان پہ ہی کیا موقوف ہے افغانستان اور ایران کے شاہانِ سلف کی تصویریں دیکھیے۔ فارسی اشعار میں شیخ کی دستارِ فضیلت اور جبّہ و عمامہ کا ذکر پڑھیے۔ چنگیز خاں کی تصویر پہ نظر دوڑائیے الف لیلے کی توضیحی مصوری دیکھیے پگڑی کسی نہ کسی صورت میں جلوہ گر نظر آئے گی۔ مشرق میں اسے ٹوپی پر ترجیح حاصل رہی ہے اور اس کی ایک صورت تو اب بھی موجود ہے کہ ہندوستان کی سرحد کے اُس پار اور اِس پار عام طور پر اسے کلاہ کے اوپر باندھا جاتا ہے۔

پگڑی نے رسم و رواج کی دنیا میں اپنی ساکھ جمائی ہے۔ دستار بندی کی رسم

اس کی مثال ہے۔ راجاؤں کے راج تلک کی رسم میں اسے طرۂ امتیاز حاصل ہے۔ خاندانوں میں جانشینی کی رسم اس سے ادا کی جاتی ہے۔ زبان و ادب پر اس کے بیش بہا احسانات ہیں۔ اس کی امتیازی حیثیت نے اس کے احترام و عظمت کا رنگ محاوروں میں بھر دیا ہے۔ "پگڑی سنبھالنا" یا "پگڑی پاؤں پر رکھنا" کثیرالاستعمال محاورے ہیں۔ اور ان میں پگڑی آدمی کی عزت نفس کی مترادف ہے۔ "پگڑی سنبھالنا" ناموس برقرار رکھنے کے معنی کا حامل ہے۔ پنجابی کا یہ مصرعہ اس کی خاطر خواہ تشریح کرے گا۔ ع "پگڑی سنبھال او جٹّا پگڑی سنبھال اوئے" خدا کی شان کہ جہاں اہل دولت و ثروت کے لیئے یہ مایۂ افتخار سمجھی گئی وہاں شیخ و واعظ کے لیئے جامۂ مکر و فریب۔ لیکن بغور دیکھیں تو دستارِ فضیلت کا مضحکہ اڑانے والوں کے پیش نظر شیخ و واعظ کی وہ جماعت ہے جو بے عمل علم کے ڈھونگ پر اپنی انسانی فضیلت کا گھروندا تیار کرتی ہو حقیقت میں یہ دستار فضیلت کا مضحکہ نہیں مثال کے طور پر۔

نہ چھیڑ اے شیخ ہم رندوں کو جا کیا آئی شامت ہے

دھری رہ جائے گی سر پر جو دستارِ فضیلت ہے

کنایہ یہاں بھی شیخ کی خشک پارسائی کی طرف ہے دستارِ فضیلت کا گھٹیا پن مقصود نہیں۔

اب رہا سوال کہ اتنی عظمت و فضیلت کی آئینہ دار ہوتی ہوئی پگڑی عالم گیر کیوں نہ ہو گئی۔ تو اس کا جواب فلسفے کے اس نظریے سے پوچھئے جس کے مطابق دنیا میں ہر شئے کی ایک ضد موجود ہے۔ بدی نہ ہو تو نیکی پہچانی نہ جائے۔ اندھیرا نہ ہو تو اجالے کی ہستی نہ رہے۔ پھول اور کانٹے۔ خیر و شر۔ شادی و غم ایک دوسرے کے لیئے لازم و ملزوم

ہیں۔ نغمہ و فریاد ہی سے تو یہ بات حل ہوتی ہے کہ دنیا مجموعۂ اضداد ہے۔ پگڑی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ٹوپی یا کلاہ پگڑی کی ضد اوّل ہے تو اہل بنگال کی برہنہ سری اس کی ضد آخری۔ روئیدگی نباتات کی خواہش حیات کا دوسرا نام ہے۔ اور پگڑی آدمی کی نموئے عظمت کا احساس فطری۔ نموئے عظمت کی کارفرمائی ہی تو ہے جس سے انسان کو مخلوق میں شرف اولیّت حاصل ہے۔

فلسفے کے ایک ناقابل تردید قول کے مطابق نیکی حقیقت اور حُسن تین قدریں ہیں جنھوں نے تمدن پر حکومت کی ہے مذہب اور اخلاقیات انسان کو نیکی کی طرف مائل کرتے ہیں علم حقیقت کی دریافت کی طرف لے جاتا ہے۔ فنون لطیفہ تخلیق حسن میں محو کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک چوتھی قدر دستار ہے۔ دستار نے انسانی تمدن پر اسی دبدبے اور جلال سے حکومت کی ہے۔ جس دبدبے اور جلال سے تینوں قدروں نے۔ دستار نے انسانی تمدّن کو آئین سلطنت سکھایا ہے۔ سماج پر قانون کی گرفت کو محکم کیا ہے۔ اور اخلاق کے سمدن عناصر کو پختگی عطا کی ہے۔

یہ تو تھا پگڑی اور دستار کی عظمت کا تجزیہ فلسفے کے زیر نظر۔ اب دیکھئے اس کی ہمہ گیری اور رنگارنگی۔ شاہان مغلیہ اور راجگان ہند کے درباروں سے نکل کر ہندوستان کے بسیط ملک کے مختلف حصّوں کی سیر کیجئے اور دیکھئے پگڑی کے مختلف رنگ۔ پنجاب[*] کے مغرب میں کلاہ کے اوپر اپنی فضیلت کا پرچم لہرا رہی ہے اور طرہ طرّار ہے کہ اپنی عظمت کے احساس میں فلک بوس ہونے کا تمنائی ہے۔ مزاج کی سلامتی

---

* یہ مضمون تقسیم ملک سے پہلے لکھا گیا تھا۔

اور تجارتی ماحول کی سرم کاری دیکھنا ہو تو وسطی پنجاب میں پگڑی سے طرّے کا غائب ہونا دیکھیے ذرا مشرق میں چل کے دیکھیے پگڑی کے پیچ مزاج کی بے پروائی اور مشقت کی افتاد کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ان فضاؤں میں سکھوں کی سخت کوشی ان کی جنگ آفریدہ اور جنگ آزمودہ فطرت اور ارادوں کا استحکام ان کی دستار سے نمایاں نظر آئیں گے۔

مارواڑی پگڑی کا طول اور اس کے پیچوں کا اہتمام ظاہر کرتا ہے کہ اس قسم کی پگڑی پہننے والے سرمایے کے اجارہ دار اور حساب کے گورکھ دھندوں کے ماہر ہیں سرمایے کی پشت در پشت حفاظت کے دھنی ہیں۔ تاجر اور اس قسم کے محتاط تاجر کہ تجوری بھر لیں مٹّی کا سونا بنا لیں۔ زندگی کو طول امل کا رنگ دیں مگر قدامت کے پابند رہتے ہوئے اسلوب زندگی کا رشتہ ماضی سے جوڑے رکھیں گے۔ مرہٹوں کی گول اور ہموار پگڑی ان کے چاق و چوبند ہونے کا ثبوت ہے۔ ان کی چابک دستی اور تیز ذہانت کا آئینہ ہے کہیں یہ نوک پلک پر بھی اتر آتی ہے اور گوالیاری انداز کو دیکھو تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کسی کمان دار نے کمان پہ تیر کسا ہو۔ ہندو مسلمان کے میل جول سے ان کی معاشرت میں ہم آہنگی دیکھنی ہو تو آصف جاہی پگڑی پر نظر دوڑائیے۔ اس کی ہمواری اور بلندی سے علو جاہ اور متانت نفس کا رنگ جھلکتا ہے۔ کہنے کو تو یہ پگڑی پہننے والے اپنے نام کے ساتھ "جنگ" کا پُرہیبت مابعد رکھتے ہیں لیکن آشتی اور رواداری ان کے جچے تلے اور متوازن چہروں سے ظاہر ہوتی ہے اور اس توازن کے عطا کرنے والی ان کی پگڑی یا دستار ہے راجپوتوں کی سپہ گری اور جنگ جوئی ضرب المثل ہو چکی ہے ان کی تاریخ بہادری اور شجاعت کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ ان کارناموں کی جھلک ان کے چہروں سے نمایاں ہو نہ ہو ان کے

دوسرے لباس سے ان کا اظہار ہو نہ ہو ان کی بھاری بھرکم پگڑی اور اس کا ایک طرف کو خاص جھکاؤ ان کی پیشانی پر جنگ آزمودگی کی مہر ثبت کرتا ہے۔ اس طرح ہندوستان کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے میں جائیے جو رنگ مدراس میں ہے وہ مہاراشٹر میں نہیں۔ جو صورت راجپوتانے کی ہے وہ کشمیر میں نہیں اس پر بھی محسوس یہ ہوتا ہے کہ جس طرح درد و کرب ہیجان و اضطراب مسرت و انبساط راحت اور خوشی انسان کی متاع مشترک ہیں۔ اسی طرح پگڑی بھی انسان کی متاع مشترک ہے۔ فطرت اور ماحول کی تبدیلی کے ساتھ یہ بھی تبدیل ہوتی ہے مگر اس کا وجود عدم نہیں ہوتا۔ ہندوستان کی سرحد کے پار اس کا رواج تھا اور ہے۔ ہندوستان سے باہر جائیے تو یہ ہمارے ہندوستانی ہونے کا ثبوت پیش کرتی ہے مشرقی انداز کے ہندوستانی درباروں میں پگڑی درباری لباس کا ایک ضروری حصّہ ہے ہندو اور مسلمان ریاستوں میں یہ دونوں قوموں میں یک جہتی اور ہم آہنگی کے عناصر پیدا کرنے میں پیش پیش ہے۔ فوج اور پولیس کی وردیوں کا ایک ضروری جزو ہے۔ مُلّا اور پنڈت کی فضیلت اس سے نمایاں ہوتی ہے۔ لیڈروں نے اسے اپنایا۔ ادیبوں نے اس کی حفاظت کی۔ شعراء نے اسے سر کی زینت بنایا دور جانے کی ضرورت نہیں لالہ لاجپت رائے نے اپنی مغربی سیاحت میں بھی اسے اپنائے رکھا۔ پنڈت مدن موہن مالویہ نے عمر بھر اسی کی رفاقت کا دم بھرا۔ بال گنگا دھر تلک اور گوپال کرشن گوکھلے اپنی مشرق پسندی کے ساتھ ساتھ اسے پسند کرتے رہے۔ مولانا گرامی اور مولانا محمد حسین آزاد دستار پسندی میں فراخ حوصلگی کا ثبوت دیتے رہے۔ زندہ دلان پنجاب کے طُرّوں کے ساتھ ساتھ مدراس کے اکابر کی مدراسی پگڑی اپنے صوبائی احساسات کے اظہار

میں پیش پیش ہے - سر راما سوامی مدلیار - سر سی - پی - راما سوامی آئر اور سر رادھا کرشنن اس ضمن میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں لیکن اس عظمت و جلال کی حامل ہوتے ہوئے بھی پگڑی ایک خاص طبقے کی نظروں میں محض قدامت اور بے وقعتی کا نشان بن کر رہ گئی ہے - یہ امر قابل افسوس ہے کہ سرکاری دفتروں، کالجوں، مغربی نوعیت کی تفریح گاہوں اور اپ ٹو ڈیٹ قسم کے ہوٹلوں میں پگڑی کو عزت و توقیر تو کیا حاصل ہوگی اسے کم مائیگی کا نشان قرار دیا جاتا ہے - بے وقعتی کی دلیل مانا جاتا ہے - اور دور حاضرہ کی پستی و بے باکی سے قطعی نابلد اور بے بہرہ قرار دیا جاتا ہے - ایک رعونت کے ساتھ اس کی طرف سے آنکھ پھیر لی جاتی ہے - ایک نخوت اور نفرت بھرے انداز سے اس کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے - اچھی ملازمتیں حاصل کرنے میں یہ سدِّ راہ ثابت ہوتی ہے - اسے آدمی کی ذہانت اور علمی فضیلت کی پردہ دار تو کیا پردہ پوش بھی نہیں سمجھا جاتا مغرب زدگی اور ہر چیز کو مغربی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی عادت بقول خود اور بزعم خود ماڈرن طبقے کی فطرت ثانیہ ہو چکی ہے - پگڑی مشرق کا جوہر خاص ٹھہری انہیں اس دور میں کس طرح پسند آئے - ہندوستان کی آبادی کا یہ قلیل جزو اپنے آپ کو ہندوستان کے موجودہ تمدّن کا نمائندہ نہیں قرار دے سکتا - اور اپنی آواز کو ہندوستان کے ان کروڑوں افراد کی زبان نہیں گردان سکتا جو ابھی گاؤں کی غیر آلودہ فضا میں اپنی ذات اور ذاتی حیثیت کو قائم رکھے ہوئے ہیں - انھیں ان وقتی خوش باش خوش پوش اہل علم و فضل سے کم واسطہ پڑتا ہے اور وہ اپنی مشرق پسندی کو صرف مشرق پسندی کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ اپنے ماحول کے تقاضے سے قائم رکھے ہوئے ہیں - تمدّن کا نقاد اسے غلط قسم کی اجداد پرستی سے تعبیر کرے گا مگر سادگی اور سادہ نفسی کی استقامت

کو اجداد پرستی کہنا بد ذوقی کی دلیل ہے۔ زمانے کے انقلابات کے ساتھ ساتھ یوں تو ہر چیز تبدیل ہوتی رہتی ہے لیکن وہ تبدیلیاں جو مصلحت وقت یا مصلحت خوش فہم کے تحت کی جاتی ہیں دیرپا نہیں رہتیں۔ اس لیئے ہمیں امید ہے کہ یہ نام نہاد تعلیم اور تمدن کا اجارہ دار طبقہ پھر اپنے ڈھب پر آئے گا اور پگڑی کو بہ رضائے خود اختیار نہیں کرلے گا تو کم از کم اسے چشم رعونت سے بھی نہیں دیکھے گا۔ اس کی تعظیم نہیں کرے گا تو کم از کم اس سے بے اعتنائی بھی نہیں برتے گا۔

تہذیب یا تمدن جب اپنے قیمتی خزانے لٹا بیٹھتے ہیں تو اس کی رہی سہی نشانیاں اُن لوگوں کے پاس رہ جاتی ہیں۔ جنہیں زمانہ درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا۔ یہی حال اس مغرب نواز فضا کا ہے ان کی اپنی دستار تو اتر ہی چکی ہے۔ لے دے کے باقی رہی تو چپڑاسی یا بیرا کے پاس۔ یہی غنیمت ہے کہ کوئی اس عظمت کا پاسدار تو ہے۔ شاید وہ وقت قریب ہے جب اس حفاظت سے رکھی ہوئی دولت کو ان کے سروں سے سمیٹ کر اپنے سروں پر لپیٹا جائے گا۔ دنیا میں ایسا ہوتا آیا ہے۔ بزرگوں نے اوقاف بنائے اولاد ان کی آمدنی کھانے کے لیئے خود متولی بن بیٹھی۔ ہمیں اس وقت کا انتظار کرنا چاہیئے جب سرکاری دفتروں میں بھی اس کی عظمت کا احساس ہوگا۔ جب جدید سے جدید قسم کی تفریح گاہیں اسے لباس معیوب کا خطاب نہ عطا کریں گی۔ جب اسے چپڑاسی اور بیرا کا سرپوش ہی نہیں سمجھا جائے گا۔ اسے دیکھا جائے گا تو ٹیپو جیسے آزاد سلطان کی آزادروی یاد آئے گی۔ اسے دیکھا جائے گا تو گورو نانک کی سلامت روی کا نقش دل پر جمے گا۔ اسے دیکھا جائے گا تو شاہجہان کی صورت اور تاج کی صورت میں اس کی نقش آفرینی یاد آئے گی۔

ہم نے اپنے مذاق کی قید لگائی ہے تو کسی کا گلہ کرنا بھی فضول ہے۔ البتہ ایک گلہ زمانے کی دست بُرد سے ہے جنگ اور جنگ کے اثرات سے ہے اور وہ یہ کہ کپڑے کے راشن نے پگڑی کی ہستی کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ لیکن یہ تو ہنگامی سی بات ہے۔ کپڑے کا راشن اور پابندیاں کب تک رہیں گی۔ پگڑی نے تو ہزاروں انقلاب دیکھے ہیں۔ اس کے سامنے تخت وتاج لٹے ہیں اس کے سامنے زمانے نے ہزاروں کروٹیں لی ہیں اور لیتا رہے گا۔ اور یہ قائم رہے گی اسی دبدبے سے اسی جلال سے اسی فضیلت کا رنگ جمائے ہوئے اور اسی وقار کا پرچم بلند کئے ہوئے۔

ضمناً پگڑی کی ایک اور قسم بھی دیکھئے۔ بڑے ستم ظریف ہیں یہ نفع خور لوگ جنھوں نے پگڑی کی ایک اور قسم ایجاد کی ہے اور اس میں کپڑے کے راشن کا مسئلہ بھی حل کر لیا ہے۔ وہ پگڑی ہے محض منافع کی رقم۔ آپ ایک مکان چھوڑیئے دوسرے کو دیجئے جو کرایہ آپ دیتے ہیں وہی تو وہ ادا بھی دے گا ایک خاص رقم محض اسے مکان دینے یا دلوانے کی فیس کے طور پر وصول کیجئے۔ یہ ہے نئی قسم کی پگڑی۔ کہاں پگڑی اور اس کی عظمت اور کہاں یہ چار سو بیس۔

آخر میں ہمیں پھر بادب یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ پگڑی یا صافہ انسان کے علو مرتبت کی دلیل ہے پست حیثیت کی نہیں۔ اس پر بھی ذاتی تجربے کی بنا پر ہمارا یہ ایمان ہے کہ مغربی قسم کے خوش پوش طبقے کے ساتھ دن گزارنا اور وہ بھی دستار شریف کی رفاقت کا دم بھرتے ہیں مشکل ضرور ہے لیکن ہم بھی تو اس کے قائل ہیں کہ بقول "مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو" ہمارے ایک کرم فرما نے اپنی نورانی داڑھی کے متعلق ایک شعر تصنیف فرمایا ہم نے اس میں تھوڑا تصرف کر لیا۔ مگر وہ تصرف بے جا نہیں سمجھئے سنئے اور داد دیجئے۔ خواہ شعر کی خواہ صافے کی سی

اس تن و توش پہ صافے کے اضافے کو نہ دیکھ ‏ ‏ میرے مضمون کو پڑھ میرے لفافے کو نہ دیکھ

کاش میری زبان ہوتی

ہسپتال

جب اپنا تعارف خود آپ ہی کروانے کی نوبت آئے تو یقیناً تکلفات کو دخل نہیں ہوتا۔ تو پھر آپ سمجھئے کہ میں ہسپتال ہوں۔ ایک ایسا ادارہ جہاں بیمار اور زخمیوں کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ دنیا میں میرے مختلف نام ہیں۔ خود اپنے ہی ملک میں مجھے شفا خانہ، نرسنگ ہوم، چکتسالیہ اور دارالشفا جیسے ناموں سے پکارا جاتا ہے لیکن جیسے میری ساخت میرا انتظام اور میرا رنگ روپ بدیسی ہے ویسے ہی میرا بدیسی نام ہاسپٹل ہے۔ تھوڑے سے ردّو بدل کے ساتھ ہسپتال کی صورت میں زیادہ مشہور ہے۔ کبھی کبھی گنوار لوگ شہر میں آتے ہیں تو راہ چلتے شہریوں سے میرا پتہ پوچھتے ہوئے مجھے دوائیوں کا ڈاک خانہ بھی کہتے ہیں۔ اسے ان کی ستم ظریفی نہیں خود اس ملک میں تعلیم کی کمی کا باعث سمجھنا چاہئے۔ ہم بہت سے بھائی ہیں اور دُنیا کے ہر مہذب ملک میں ہماری بود و باش ہے۔ بھائی چھوٹے بڑے ہوا ہی

کرتے ہیں یہی حال ہمارا ابھی ہے - کہیں مردوں کا علاج ہوتا ہے کہیں عورتوں کا بعض جگہ صرف بچّوں کی دیکھ بھال ہوتی ہے - ہم میں بہت سے حیوانوں کے علاج کے لیٔے بھی وقف کیٔے گیٔے ہیں -

فلسفی مزاج کے مبالغہ پسند لوگ تو اس ساری کائنات کو ایک بڑا ہسپتال کہیں گے کیونکہ یہاں ہر شئے کا علاج قدرت اس کے مزاج کے مطابق خود کرتی ہے - چنانچہ بہادر شاہ ظفر نے غسل صحت فرمایا تو ذوق مرحوم نے قصیدے کی تشبیب یوں شروع کی ؎

واہ وا کیا معتدل ہے باغ عالم کی ہوا
بن گیا گلزار عالم رشک صد دار الشفا

ذوق تمام دنیا کو ہسپتال بنا گیٔے البتہ شفا کے لفظ کا سہارا ضرور انہیں ملتا ہے - یہ باتیں تو جنونی قسم کے لوگ کیا ہی کرتے ہیں - آپ میرا تصوّر نئی تہذیب کے مختلف اداروں کے ساتھ کیجیے - جن میں سے اسٹیشن، بنک، ہوٹل، سینما، لائبریری، یونیورسٹی، ڈاک خانہ اور تار گھر وغیرہ ہیں - رفاہِ عام کے اداروں پر مجھے اس لیٔے فوقیت حاصل ہے کہ جہاں اور ادارے ذہنی تربیت، دل و دماغ کی تفریح، تعلیم اور رسل و رسائل کی سہولتیں بہم پہنچاتے ہیں وہاں میں صحت کا محافظ، زخموں کو اچھا کرنے والا، جان بچانے والا اور جسم کے ہزاروں قسم کے دکھ درد دور کرنے والا ہوں - اس پر بھی نہ جانے الہ آباد کے اکبر مرحوم کو کیا سوجھی کہ مجھے بے خانماں، شوقین مزاج، مغرب پسند لوگوں کی آخری جائے اماں قرار دے دیا ؎

کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر
ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا

مقصود تو تھی تضحیک نئی تہذیب کی اور پس گیا گیہوں کے ساتھ گھن بھی۔ لیکن سوچتا ہوں کہ کیا سچ مچ اکبر مرحوم کو مجھ سے یک گونہ نفرت تھی۔ غالباً نہیں ہوگی محض سخن گسترانہ بات تھی اور کہہ گئے۔ آئیے ذرا میری سرگذشت تھوڑی ترتیب اور تفصیل سے سنئے یہ تو میں پہلے بیان کر چکا ہوں میرے چھوٹے بڑے بہت سے بھائی ہر ملک میں پائے جاتے ہیں لیکن اب سنئے کہ ہم سب کیسے پیدا ہوئے۔ ہمارا جنم دنیا میں کیوں ہوا۔ ہمارے ماں باپ کون ہیں۔ ہماری زندگی کیوں کر گزرتی ہے۔ ہم ہستی کی نبض کی رفتار کس طرح دیکھتے ہیں۔ ہمارے دل کی گہرائیوں میں کیا کچھ محفوظ ہے۔ ہم دنیا کے لیے بوجھ ہیں یا باعثِ آرام و راحت۔

میری تاریخ اسی قدر پرانی ہے جس قدر انسان کی جہالت کے خلاف جنگ کی تاریخ۔ حفاظت جان ہر ذی شعور کا پہلا کام ہے۔ جوں جوں انسان نے جہالت کو ترک کیا شہر آباد کیے، سلطنتیں قائم کیں، لوگوں سے حکومتوں نے ٹیکس وصول کیے اسی رفتار سے عام لوگوں کی صحت اور تندرستی قائم رکھنے کے لیے بیماروں کی دیکھ بھال اور زخمیوں کی مرہم پٹی کے لیے ہسپتال قائم کئے گئے۔ عوام ہی ہمارے ماں باپ ہیں۔ جن کے روپے پیسے سے ہم قائم ہوئے۔ جن کی جان اور صحت کی حفاظت کا ہمیں امین بنایا گیا۔ آئیے اب میں آپ کو دکھاؤں کہ میں کن کن لوگوں کو اپنے پاس رکھتا ہوں۔ کیسی کیسی مخلوق مجھ میں آباد ہے۔ خود میرے دل کی گہرائیوں میں کیا کیا محفوظ ہے۔ بظاہر میں ایک وسیع اور کشادہ عمارت ہوں۔ جس میں دواخانہ مریضوں کے وارڈ۔ آپریشن کے کمرے، لیباریٹری یا تجربہ گاہ ڈاکٹر اور دوسرے اسٹاف کے کوارٹر وغیرہ ہیں۔ چاروں طرف سبزہ ہے۔ کھلی

روشنی اور پھولوں کی کیاریاں ہیں - معلوم یہ ہوتا ہے کہ کسی امیر آدمی کا محل ہے - جس میں باغ ہے پانی کے نل لگے ہیں فوارے چل رہے ہیں لوگ آتے ہیں جاتے ہیں جیسے کسی دربار میں آتے جاتے ہوں - لیکن نہیں یہ کسی فرد واحد کے رہنے کی جگہ نہیں - یہاں تو امیر غریب سب کے لئے دروازے کھلے ہیں - کوئی آئے کسی کو روک نہیں - البتہ بعض جگہیں ایسی ہیں جہاں ہر شخص کا گزر نہیں - قاعدہ قانون تو ضروری امر ہے ہر جگہ کے لیے - صبح کے وقت آیئے دیکھیے مختلف قسم کے لوگوں کا ہجوم - قسم قسم کے بیمار کسی کو آنکھ کا روگ ہے کسی کو دل کا عارضہ کسی کے دماغ میں خرابی ہے کوئی کان سے عاری ہے - غرض جتنے مریض ان سے زیادہ بیماریاں - کیونکہ ایسے مریض بھی تو ہیں جو تین تین چار چار بیماریوں میں مبتلا ہوں - لیکن وہ جیسے کہتے ہیں بال کی کھال نکالنا شاید میرے یہاں کا ہی کوئی عمل ہے - اپنے اپنے فن کے ماہر بیٹھے ہیں - کان ناک دیکھنے والے الگ ہیں - عام بیماریوں کے معالج الگ چھوت کی بیماریوں کے لیئے جگہ ہی الگ مقرر کر رکھی ہے - صفائی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے - قدامت پسند لوگ آتے ہیں تو وارڈروں، نرسوں اور ڈاکٹروں کے لباس دیکھ کر ہنستے ہیں - کوئی کہتا ہے کہ اس کے ناک میں کیا گھس گیا ہے جو پٹی باندھے ہوئے ہے - کوئی سفید ایپرن (APRON) دیکھتا ہے تو راشن کے زمانے میں کپڑے کو بے دردی سے استعمال کرنے کی شکایت کرتا ہے - لیکن یہ تو دنیا ہی ایسی ہے - اپنے اپنے خیال کے مطابق ہر شخص ہر چیز کو جانچتا ہے - اور اپنی اپنی عقل کی عینک سے اسے دیکھتا ہے -

آپ کسی گوشے میں جا کر دیکھیں آپ کو انسانی فطرت کی ہزاروں مختلف صورتیں

نظر آئیں گی۔ ہیر یہاں آنے والے اور بسنے والے سنگدل ظالم اور اپاہج بھی ہیں۔ مظلوم غریب اور دنیا کے ستائے ہوئے بے گناہ لوگ بھی۔ نیم بھی ہیں کنگال بھی۔ امیر بھی ہیں خوشحال بھی۔ فحاشی کے غلام، شراب کے مارے ہوئے، تن آسانی کے مرید شکم پری کے عادی، دل کے زخم خوردہ کوڑھ کے مریض، چور، ڈاکو، ملک کے خادم عام جنتا کے سیوک، لیڈر، کفن چور، ٹھگ، ملا، پنڈت، وید، حکیم، عامل اور بے عمل غرضیکہ سینکڑوں ہزاروں قسم کے لوگ ہیں۔ آپ ان کی کہانیاں سنیں اور پھر انہیں ترتیب دیں تو ایک کیا کتنی ہی الف لیلے مرتب ہو جائیں۔ ہر داستان داستان امیر حمزہ، ہر فسانہ فسانہ العجائب بن جائے۔ ذرا ان ڈاکٹر صاحب کو دیکھئے ان پر روز کیا گزرتی ہے۔ وہی جو روز اس قسم کے سینکڑوں مریضوں کی کہانیاں سنتے ہیں انہیں دلاسا بھی دیتے ہیں اور دوا بھی تجویز فرماتے ہیں۔ اور پھر سوالوں کا ایک طومار۔ اجی کیا پالک کھاؤں۔ پالک تو بہت گراں ہے اور پالک نہ ہوتی تو ارہر کی دال۔ کھانے سے پہلے یا کھانے کے بعد دوائی لوں۔ اٹھ کے پیوں بیٹھ کے پیوں سوؤں یا نہ سوؤں۔ ماں سے بات کروں یا باپ سے الغرض جس کو دیکھو ایک عجیب قسم کے مراق میں مبتلا ہے۔ یہ انہیں ڈاکٹر صاحب کا دم خم ہے کہ روز ایسے ہی بے ربط سوالوں کا جواب دیتے ہیں۔ بڑی بھلی سنتے ہیں اور اپنے دماغی توازن کو قائم رکھتے ہیں۔ ورنہ یہ وہ جگہ ہے جہاں بڑے بڑوں کے پاؤں اکھڑ جائیں انسانی جسم سے خارج ہونے والی تمام غلاظتوں کے کیمیائی امتحان کرنے کا بھی پورا انتظام ہے۔ قابل احترام ہیں یہ لوگ جو ہر اس غلاظت کی جانچ اور تحقیق کرتے ہیں جنہیں خود اپنے جسم سے خارج کر کے آدمی چھونا بھی پسند نہیں کرتا۔ خون، تھوک، پیپ

پیشاب، پاخانہ کسی چیز سے یہ لوگ نفرت نہیں کرتے۔ مریض کے جسم میں بیماری کی وجہ ڈھونڈنے کے لئے ان تمام چیزوں کا امتحان کرتے ہیں۔ پھر بھی مریض بعض اوقات کہہ دیتے ہیں کہ ڈاکٹر لوگ بڑے بے درد ہوتے ہیں۔ بات بات پر فیس مانگتے ہیں۔ انسانی ہمدردی تو ان میں نام کو نہیں۔ اور یہ باتیں عام طور پر وہ لوگ کرتے ہیں جن کو خدا کے فضل سے ہر طرح کی فیس ادا کرنے کی توفیق حاصل ہوتی ہے۔ انسانی ہمدردی کی مثال تو یہاں ہر ہر قدم پر ملے گی۔ خود ہسپتال کا وجود اس جذبے کا منت پذیر ہے۔ یہاں تو جرّاح کے نشتر میں بھی جذبۂ ہمدردی ہے۔ بڑھی ہوئی آنت کو کاٹ پھینکتا، اور فاسد مادہ کو خارج کر دیتا ہے۔ بعض اوقات تو زہر پکڑے ہوئے دست و بازو یا ٹانگ کو بھی کاٹ دیتا ہے۔ مقصد جان بچانا جسم کو آرام پہنچانا اور دکھ درد دور کرنا ہوتا ہے نہ کہ ایذا رسانی۔ مریض کو سلانے کے لئے یہ لوگ خود جاگتے ہیں۔ نازک سے نازک گھڑی میں بھی مریض کے ساتھ رہتے ہیں۔ مریض کی جو خدمت یہاں ہوتی ہے وہ گھر میں نہیں ہو سکتی۔ اس پر بھی ابھی عام لوگوں کو جب کوئی صحیح الدماغ ہسپتال میں داخل ہونے کا مشورہ دے تو وہ جھجکتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ گھر آخر گھر ہی ہے۔ گھر جیسا آرام کہاں۔ یہ کسی پھل کو بغیر چکھے اس کا ذائقہ بتانے کے مترادف ہے۔ پرانے خیالات کے ساتھ چپکے رہنے والی بات ہے۔ مسلسل اور مہلک بیماری کے مریض کو جو آسانیاں ہمارے یہاں مل سکتی ہیں گھر پر نہیں مل سکتیں۔ اور پھر ہر چیز ایک خاص قاعدے کے ساتھ ہوتی ہے۔ کھانا وقت پر۔ پانی وقت پر۔ اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا خاص اجازت سے اور خاص قاعدے سے۔ مریض تو خیر مریض ہوتا ہی ہے وہ مرض کے ہر مرحلے سے گزرتا ہے۔ ہر طرح کی سختیاں جھیلتا ہے۔ کبھی امید بندھتی ہے کبھی مایوسی کا شکار

ہوتا ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ تکلیف اس کا علاج کرنے والے اور اس کی دیکھ بھال کرنے والے اٹھاتے ہیں۔ لیکن کیا مجال کہ کبھی کوئی نا ملائم کلمہ کسی کی زبان سے نکلا ہو۔ یا تیور سے کبھی غم و غصہ کا اظہار ہوا ہو۔ مریض کی تشفی اور دلجوئی ان کا پہلا فرض ہے۔ اور اس فرض کے ادا کرنے میں وہ اپنی جان پر ہر جبر برداشت کرتے ہیں۔ ہر دکھ سہتے ہیں اور پورے صبر اور تحمل کا ثبوت دیتے ہیں۔ جہاں انسانی ہمدردی کا ایسا ثبوت ملتا ہو اس کے حق میں اہل زبان بے ہودہ محاورے تراشیں یہ حق و انصاف کے خلاف بات نہیں تو اور کیا ہے۔ مریض گھر میں زیادہ ہوں تو کہہ دیتے ہیں گھر کا گھر ہسپتال بنا ہوا ہے۔ گویا ہسپتال کوئی بری جگہ ہے یوں تو خدا سب کو صحت دے پھر بھی مریض کے لئے تو میں ایک جنت سے کم نہیں۔ بالکل ایسی ہی جنت جیسی ایک سابق ہوم ممبر کے قول کے مطابق جزائر انڈیمان یا کالا پانی قیدیوں کے لئے ہے۔ وہ جنت تو موضوع بحث بنی رہی ہے۔ میرے جنت ہونے پر سب متفق ہیں۔

میرے دل کی گہرائیوں کے محفوظ خزانے بھی دیکھئے۔ کسی بے کس ماں کا بیٹے کے غم میں رات دن گھلنا۔ کسی معصوم اور نو عمر بیوی کا خاوند کی صحت کے بارے میں اضطراب۔ خویش و اقارب سے بچھڑے ہوئے بچوں کی بے قراریاں۔ مذہب کے نام پر انسانی خون پینے والے انسان نما درندوں کے ستائے ہوئے مظلوموں کی پُر الم داستان لڑائی جھگڑا، فتنہ فساد، آتش زنی اور جنگ کے شکار مرد عورت اور بچوں کے دلوں میں بیٹھ کر دیکھئے وہ دنیا کی ناپائداری کے کس قدر قائل ہو چکے ہیں۔ مال و دولت جائداد زمین مکان سب کو کھو کر جنھوں نے اپنی جان کو بچانے کا جتن کیا اور وہ جان بھی حملہ آوروں کے ناپاک ارادوں سے پورے طور پر محفوظ نہ رہی۔ کسی نے زخم کھایا

کسی نے ہاتھ کٹا یا - کسی کے دماغی عارضے نے زور پکڑا ان سب کو ڈھارس ملتی ہے تو میرے پاس آکر - مجھے ان سب کے دکھ کا پاس ہے - اور تمام باتوں کے باوجود میں خود اپنی جان کا دشمن ہوں - میری کوششیں خود میری اپنی ہستی کو مٹانے میں صرف ہوتی ہیں - میرا آخری منتہائے مقصد یہی ہے کہ دنیا میں کوئی مریض نہ رہے - مرض کا نام تک اڑ جائے - اگر مریض نہ ہوں گے تو میں بھی نہ رہوں گا - یہ گویا ایک شاخ پر خود بیٹھ کر اسے کاٹنے کے برابر ہے لیکن میری ہستی تو دوسروں کے لئے وقف ہے اگر اس کارِ خیر میں میری جان بھی جائے تو کوئی بڑی بات نہیں - میرا زندگی کا مقصد پورا ہو جائے گا خودکشی ایک ایسا جرم ہے جو سرزد ہو جائے تو کوئی سزا نہیں اور اگر سرزد نہ ہو سکے تو قابل سزا ہے - میری ہستی ایک ایسا جرم ہے کہ قائم رہے تو انسانی صحت کی خرابیوں کی دلیل ہے اور اگر نہ ہو تو صحت کے اچھا ہونے کا ثبوت - لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جہاں ہسپتال نہ ہوں وہاں صحت ہی صحت ہے اور جہاں ہسپتال ہیں وہاں بیماری ہی بیماری -

اپنی خوبیوں کا قصیدہ کہاں تک پڑھا جائے - لوگ تو اسے خود ستائی ہی کہیں گے تھوڑے بہت عیب بھی ہیں وہ بھی گنوا دوں - میرے یہاں رخصت حاصل کرنے کے بہانے سے آنے والے جھوٹے مریض بھی آتے ہیں - ہمسائے یا رشتہ دار پر فوجداری مقدمہ دائر کرنے کے لئے جھوٹا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے والے بھی - میرے یہاں کہیں کہیں ان لوگوں کی شنوائی بھی ہو جاتی ہے - کبھی یہ دبیسے ہی دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کبھی ملازموں کو روپے کے لالچ سے پھسلا لیتے ہیں - لیکن یہ ہر جگہ ممکن نہیں ہوتا - میرے یہاں امیر اور با رسوخ آدمی غریبوں سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں

کچھ تو یہ سوسائٹی کے نظام کا قصور ہے کچھ خود غریب اور نادار لوگوں کا۔ لیکن وہ زمانہ جلد اور بڑی تیزی سے آرہا ہے جب صحیح لوگ مجھ سے زیادہ فائدہ حاصل کریں گے۔ بڑی بڑی لڑائیوں میں چلتی پھرتی صورت اختیار کر لیتا ہوں۔ موٹر میں ہوائی جہاز پر۔ بحری جہاز پر غرضیکہ جہاں بھی ممکن ہو اپنا ڈیرا جما لیتا ہوں اس صورت سے ہر جائی بھی ہوں۔ کبھی کبھی غیر جانبداری کا بھیس بدل کر اپنے ملک کے لیئے ناجائز فائدہ حاصل کرنے کا موجب بھی بنتا ہوں۔ لیکن یہ میرا قصور نہیں۔ میرے نام کو غلط صورت سے استعمال کرنے والوں کا قصور ہے۔

خضر سکندر کو چشمۂ آب حیات کی طرف لے گیا لیکن اسے پیچھے چھوڑ گیا میری ہر دوا کی بوتل میں مریضوں کے لیئے آب حیات بھرا پڑا ہے۔ یہاں خضر کی فریب کاری بھی نہیں اور سکندر کی گمراہی بھی نہیں۔ زندگی بخش دوائیں روز روشن میں ملتی ہیں۔ فائدہ اٹھانے والوں کے لیئے میں شارع عام ہوں۔ لیکن دعا بھی کرتا ہوں کہ خدا سب کو صحت دور رکھے اور میری رونق روز و شب کم ہوتی نظر آئے۔

۱۹۴۷

برخود غلط شاعر

غلط فہمی کسی دوسرے سے متعلق ہو تو اتنی خطرناک نہیں ہوتی جتنی خود اپنے متعلق کسی اور کے باب میں غلط خیالات قائم کر لینے سے تو صرف یہی نقصان ہوتا ہے کہ ایک دل یا دماغ اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے لیکن اپنے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہو کر دنیا بھر کو گمراہ کرنے کا جو گناہ ایک برخود غلط انسان کرتا ہے۔ اس سے بڑے مہلک نتائج نکلتے ہیں۔ برخود غلط انسانوں کی دنیا میں کمی نہیں۔ جہاں عقل و ہوش کے اچھے نمونے اس دنیا میں پائے جاتے ہیں وہاں جہالت بھی اپنی پوری شان سے جلوہ گر ہے۔ برخود غلط ادیب یا شاعر قوم کو گمراہ کر دیتا ہے اس لئے برخود غلط قسم کے لوگوں میں یہ سب سے زیادہ خطرناک ہے۔

دکان دار یا تاجر برخود غلط ہو گا تو گاہکوں سے جھگڑا کرے گا۔ اپنا مال نہیں بیچ سکے گا۔ برخود غلط حکیم یا طبیب ایک خاص حلقے کی صحت بگاڑ دے گا۔ برخود غلط استاد طالب علموں کو نکمی تعلیم دے گا۔ برخود غلط وکیل مؤکلوں کے

مقدموں کو خراب کر دے گا لیکن بر خود غلط شاعر ادب اور لٹریچر کے مزاج میں داخل ہو کر ادب اور لٹریچر کو تباہ کر دیتا ہے - ادب اور لٹریچر کی تباہی پوری قوم کی تباہی بلکہ یوں کہئے نسلِ انسانی کی تباہی ہے - آئیے ذرا آپ کو چند بر خود غلط شاعروں سے ملائیں -

ایک زمانہ ہوا ایک بڑے شہر میں بہت بڑا مشاعرہ تھا - ملک کے گوشے گوشے سے شاعر اس مشاعرے میں شامل ہوئے تھے - مشاعرے میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی - وقت کی پابندی کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا تھا - اس لئے شعراء کی کثرت منتظمین کے لئے بڑی پریشانی کا موجب بنی ہوئی تھی - صدر کے پاس چٹ پر چٹ آ رہی تھی - "صاحب مجھے دو ہی منٹ مل جائیں تو چار شعر پڑھ کر اپنی جگہ پر آ جاؤں گا" اب کس کس کی خواہش پوری کی جائے - ایک منچلے جوان جو اپنی شکل، صورت اور لباس سے اچھے خاصے شاعر معلوم ہوتے تھے اسٹیج پر آ دھمکے - اپنے نام کے ساتھ لمبے لمبے القاب لکھ کر لائے اور کسی برگزیدہ ہستی کا سفارشی خط بھی - منتظمین نے ہزار سمجھایا کہ وقت نہیں لیکن انہوں نے کہا کہ حضرت ان تمام شعراء میں ایک بھی میری ٹکر کا نہیں - ذرا دو منٹ تو دیجئے - دیکھئے میری آواز کا لوچ اور میرے کلام کی بلاغت - زمین آسمان نہ ملا دوں تو میرا نام نہیں - کلکتہ، بمبئی، دہلی، شملہ، علی گڑھ، لکھنؤ اور نہ جانے کہاں کہاں دادِ سخن دے چکا ہوں - میں قدیم رنگ کا دلدادہ نہیں البتہ بڑے پرانے فن کار استادوں سے میں نے فن شاعری سیکھا ہے اور بیک وقت دس استادوں کا شاگرد ہونے کا مجھے فخر حاصل ہے - چلبلا شاعری اور وہ بھی ترقی پسند شاعری اب میرا خاص میدان ہے لیکن عام ترقی پسندوں سے

ہٹ کر چلتا ہوں۔ اسٹیج پر اس طرح کی گفتگو جو ادبی زبان میں ہو رہی تھی حاضرین اور پڑھنے والے شعراء کو بہت ناگوار گزری۔ کسی نے زور سے آواز دی "صاحب خاموش ہو جائیے۔ ان کو باہر نکالیے یہ تو آج سے قبل کتنے ہی مشاعرے خراب کر چکے ہیں"۔ دیوانے کو ایک ہو بہت ہے وہ فوراً کود ے اور اسٹیج پر قابض ہو گئے مطلع عرض ہے کہا اور ایک بے سر وپا مطلع داغ دیا۔ سننے والے سنجیدہ کم ہوتے ہیں۔ خوش طبعی کو شگوفہ مل گیا۔ واہ واہ کے شور اور سبحان اللہ کے نعروں سے ہال گونج اٹھا اجی کیا مطلع فرمایا ہے۔ واللہ قلم توڑ دیا ہے۔ یہ صاحب سمجھتے ہیں کہ داد مل رہی ہے صدر مشاعرہ خاموش بیٹھے ان کا منہ تک رہے ہیں۔ کیا واقعی وہ صدر ہیں یا نہیں اس کا انہیں شبہ ہو رہا ہے۔ شبہ نہیں بلکہ یقین ہوتا چلا جا رہا ہے۔ پھر بھی انھوں نے نہایت سنجیدگی سے اپنے حواس بجا کر کے ایک چٹ لکھ کر مشاعرے کے ہیرو کے سپرد کی۔ غالباً یہ درخواست تھی کہ آپ ناخواندہ مہمان بن کر مشاعرے کا مزہ خراب نہ کریں لیکن اب ان کی آبرو کا سوال تھا۔ شاعر اور وہ بھی برخود غلط۔ انھوں نے حاضرین کو مخاطب ہو کر کہا کہ "حضرات مجھ سے کہا جا رہا ہے کہ میں ناخواندہ مہمان ہوں۔ کیا آپ میری اس توہین کو برداشت کر سکیں گے"۔ حاضرین نے کہا۔ نہیں ہرگز نہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا"۔ اس سے ان کے حوصلے اور بڑھے اور جھٹ انہوں نے پینترہ بدلی کر دوسرا شعر پڑھا۔ شعر کیا تھا صنعت بے بحری کا نمونہ نہ قافیہ نہ ردیف نہ وزن نہ خیال۔ غرض مہمل گوئی کا ایک اچھا نمونہ تھا۔ یہ ہماری بد ذوقی ہے کہ ہمیں یاد ہے ملاحظہ فرمائیے ؎

فردوس میں خیال کسے تھا کہ بیٹیں خون جگر　　　اچھا ہوا کہ عدم سے دنیا میں آ گئے

ارے یار قلم توڑ ڈالا - شاباش میرے شیر اس طرح فرماتے جاؤ - کیا کیا داد مل رہی تھی - بد تمیزی کی حد ہو چکی تھی - آخر حاضرین پر بھی سنجیدگی کا موڈ طاری ہوا کسی منچلے نے کیلے کا چھلکا شاعر پر پھینکا - اس کے بعد اتنا یاد ہے کہ کچھ نوجوان اسٹیج پر آئے اور شاعر صاحب کو گھسیٹ کر ہال سے باہر لے گئے - نہیں معلوم کہ بعد کی یہ افواہ صحیح ہے یا نہیں کہ وہاں ان کی خاطر خواہ مرمت کی گئی - لیکن وہ اس بات سے خوش تھے کہ انہوں نے منتظمین سے اچھا انتقام لیا اور قوم و ملک کے نام جو پیغام وہ اپنی شاعری کے ذریعے دینا چاہتے تھے دے کے ہی چھوڑا -

اب آپ ہی انصاف فرمائیں کہ ایسے شاعر جس قوم کو پیغام دینے پر اڑ جائیں اس قوم کا حشر کیا ہوگا - ایسے شعرا کی بے شمار قسمیں ہیں - ایک محفل میں ایک ایسے ہی صاحب تشریف فرما تھے - ہر چند ہم نے کہا کہ آپ خاموش ہی رہیں تو بہتر ہے - آپ کی ٹکر کا کوئی شاعر یہاں موجود نہیں - یہاں کلام سنانا آپ کی توہین ہے لیکن وہ کب رکنے والے تھے - ہماری ہی ایک غیر معروف نظم سنادی - دو ایک سننے والے ذرا شک و شبہ کی نظر سے ان کو دیکھنے لگے اور ایک دو خود ہمیں - یہ فیصلہ کرنا ان لوگوں کے لئے مشکل ہو گیا کہ آخر یہ نظم ہے کس کی تصنیف - محفل ختم ہوتی تو یار لوگوں نے پھبتی کسی - ایک نے تو کھلم کھلا کہہ دیا کہ حضرت یہ نظم جو آپ نے ارشاد فرمائی کہیں شائع ہو چکی ہے اور غالباً کسی اور صاحب کے نام سے شائع ہوئی ہے - انہوں نے نہایت برجستہ جواب دیا میں نے کب کہا تھا کہ یہ نظم میری ہے - ہوگی جس کی ہوگی - یہاں تو سنانے سے اور خود کو شاعر کہلوانے سے کام ہے - آخر ہم نے کیا قصور کیا ہے کہ ہم اپنے آپ کو شاعروں میں شامل ہی نہ کریں - یہ تو ہمارا روز کا معمول ہے - جس کی نظم

ملی سُنادی داد ملی تو بہتر نہ ملی تو ہمارے ہاتھ سے کیا گیا۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم اچھے شاعر ہیں۔ کبھی نہ کبھی خود کہنا بھی آجائے گا"۔ غرض اس امید میں وہ عمر بھر غلط فہمی کا شکار رہے۔ افسوس کہ پچھلے دنوں وہ انتقال فرما گئے۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اب ایک اور بزرگ کا حال سنیئے۔ وہ اپنے آپ کو کبھی میر اور کبھی غالب کا شاگرد بتاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مجھے ان سے روحانی تلمذ ہے۔ خواب میں کبھی کبھی ان سے صلاح بھی لیتا ہوں۔ اس روحانی تلمذ کے فیض سے دونوں کا رنگ بہ یک وقت اختیار کیا ہے۔ بڑے سنجیدہ اور خاموش فطرت انسان ہیں۔ کبھی کسی کے شعر پر سر نہیں ہلاتے۔ زبان سے داد دینا تو بڑی دُور کی بات ہے۔ اکثر عجیب عجیب زمینوں میں غزلیں کہتے ہیں۔ بالعموم مشاعرے کے آخر میں پڑھتے ہیں اور محفل کو زعفران زار بناتے ہیں۔ یار لوگوں کو انھیں چھیڑنے کے بڑے ڈھنگ یاد ہیں۔ کبھی ٹھٹکے سے پڑھنے کی فرمائش کرتے ہیں کبھی ترنم آمیز تحت اللفظ سے۔ یہ بھی خاموشی سے سب کی فرمائش پوری کرتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ سب لوگ ہنستے ہیں مگر ان کے چہرے کی متانت جوں کی توں رہتی ہے۔ ایک دفعہ لوگوں نے انہیں صدر مشاعرہ بنا دیا اور اعلان کر دیا کہ آج سے یہ ملک الشعراء بنا دئے گئے ہیں۔ اب وہ اپنے نام کے ساتھ ملک الشعراء خلیفۂ میر و تلمیذ غالب لکھتے ہیں۔ اس پر تعجب نہیں کہ وہ ایسی اُول جلُول باتیں کرتے ہیں بلکہ تعجب اس بات پر ہے کہ وہ ان تمام باتوں پر یقین رکھتے ہیں اور پوری ایمان داری سے میر و غالب کے فیض روحانی پانے پر فخر کرتے ہیں۔ دنیا بر خود غلط لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ لیکن ایسی مثال ہم نے بہت کم دیکھی ہے۔ حمایہ

مشاعرہ بنا کر لوگوں نے ان کے گلے میں اتنے ہار ڈالے کہ ان کا چہرا نظر نہیں آتا تھا ننھی سا نازک جسم بیچارے ہاروں کے بوجھ تلے دبے جا رہے تھے۔ شعر پڑھنا ان کے لئے مصیبت ہو گیا۔ داد دینے والے بڑھ بڑھ کر داد دیتے اور ان کے ہاتھ خود شاعر کے منہ تک پہنچ جاتے۔ اتنے میں کسی بد تمیز نے پرانے جوتوں کا ایک ہار ان کے گلے میں ڈال دیا۔ اس بد تمیزی نے شوخ طبعوں کے شغل کو ختم کر دیا۔ اور یہ پُر لطف صحبت تھوڑی سی بد مزگی کے ساتھ ختم ہو گئی۔

کچھ شاعر ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اپنی علمیّت کا سکّہ جمانے کے لیئے بڑے ثقیل لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ایسی ایسی تشبیہیں پیش کرتے ہیں کہ سننے والے حیران رہ جاتے ہیں۔ ہر مشاعرہ اپنے اشعار کی شرح کرتے ہیں۔ دوسروں کو بے وقوف سمجھ کر خود بے وقوف بنتے ہیں۔ استادوں کی زمینوں میں غزلیں کہہ کر موازنہ اور مقابلہ کرتے ہیں۔ کسی کی سنتے نہیں خود اپنی سناتے جاتے ہیں۔

ایک قسم اور بھی ہے۔ وہ پڑھے لکھے اور بھلے چنگے لال بجھکڑوں کی ہے۔ دولت و ثروت عہدہ عزّت اور سب چیزیں حاصل ہونے کے بعد انہیں یہ بھی تمنّا ہوتی ہے کہ شاعر کہلوائیں۔ شاعر ہر محفل اور ہر مجلس میں احترام سے دیکھا جاتا ہے انھیں بھی یہ سرخاب کا پر لگانے کی سوجھتی ہے۔ ایسے حضرات مشاعروں کا اہتمام کرتے ہیں اور خود ہی صدارت بھی فرماتے ہیں۔ شعر پڑھتے ہیں تو بڑے فخر سے استادوں کا نام لے کر پکارتے ہیں کہ دیکھیئے یہ فلاں کے مقابلے میں شعر کہا ہے اور یہ فلاں کے۔ ان کے کسی شعر کی چُول درست نہیں ہوتی۔ معمولی شُد بُد سے بڑے پختہ گو بننے کا دعوے کرتے ہیں۔ کبھی کبھار دوسروں سے بھی کہلوا لیتے ہیں۔ ایک مصرع خود کہا اور آٹھ دس کسی

حاشیہ نشین سے کہلوائے - چلو چھٹی ہوئی - شاعر بن گئے - لیکن یہ لوگ مشاعرے کی فضا کو خراب کرتے ہیں، ہنگام داد سے مزا کرکرا کر دیتے ہیں - اچھا شعر ان کی سمجھ سے دور ہوتا ہے - غلط شعر پر سر دھنتے ہیں - اب اس سے بڑا برخود غلط کون ہوگا - یہ قسم ادب اور ملک کے لیے سب سے خطرناک ہے - جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ خدا ہمارے دوستوں سے بچائے وہاں ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ خدا قوم اور ملک کو ایسے برخود غلط شاعروں سے بچائے -

پری گُل فام

محکمہ آثارِ قدیمہ پرانی یادگاروں کی حفاظت کرتا ہے لیکن نہ جانے کیوں ننجا ناتھ کی کار ابھی تک اس محکمے کی عنایت سے محروم ہے۔ "لیلیٰ کو مجنوں کی آنکھ سے دیکھو" یہ مثل مشہور ہے۔ یہی حال اس کار اور ہمارے دوست ننجا ناتھ کا ہے۔ وہ بڑے فخر سے اس کی تعریف کرتے ہیں۔ اس کی خوبیوں کے گُن گاتے ہیں۔ وہ سو میل کے سفر پر جب یہ ہردوار گئے تھے تو ہمیں ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی۔ ہم جانتے تھے کہ اتنا لمبا سفر سنہ ۱۹۲۶ء کے ماڈل پر خطرے سے خالی نہیں۔ محض پچیس سال پرانی موٹر دیکھنے میں اتنی پرانی نہ تھی۔ رنگ و روغن نے بڑھاپے میں بھی اُسے جوانی کا رنگ رُوپ دیا تھا اور سچ پوچھئے تو خود ننجا ناتھ اس پر دل و جان سے عاشق تھے۔ انہوں نے اس کا نام پری گُل فام رکھا تھا۔ ہم نے تجویز پیش کی کہ پچیس سال جس موٹر نے خدمت کے فرائض ادا کئے ہوں، اس کی سلور جوبلی منانا چاہیئے۔ ہردوار اس کے لئے موزوں نہیں ہیں یہ کارِ خیر ہو جائے تو اچھا ہے۔ لیکن وہ کب رُکنے والے تھے۔ گئے اور ساتھ ننکر کو بھی

ے گئے۔ ہم نے چلتے وقت دعا دی۔ ع۔ بہ سلامت روی و باز آئی۔ آدھی دعا کامیاب ہوئی یعنی یہ لوگ واپس تو آ گئے لیکن سلامتی سے نہیں۔ سلامتی سے اس لئے نہیں کہ شنکر نے ہمارے سامنے اقرار کیا کہ آئندہ کبھی اس موٹر کی سواری نہیں کریں گے۔ نہ جانے کیا تلخ تجربے تھے۔ کتنی بار یہ راستے میں رُوٹھی کتنی بار جم کر رہ گئی۔ نتجا ناتھ قد و قامت کے لحاظ سے تو چھوٹے ہیں لیکن دل کے بڑے ہیں۔ جوانمردی سے موٹر کی ضد کا مقابلہ کیا۔ بعض اوقات کئی فرلانگ تک کار کو خود دھکیلنا پڑا۔ شنکر بھی تو دھان پان تھے۔ لہو پسینہ ایک ہو گیا۔ ریل میں جاتے۔ فرسٹ یا سیکنڈ کلاس میں آرام سے لیٹتے۔ یہ کیا مصیبت مول لے لی۔ زحمت الگ اور موت کا خطرہ الگ۔ لیکن اب تو چھٹکارا ناممکن تھا۔ کانوں کو ہاتھ لگاتے۔ اپنی قسمت کو کوستے۔ نتجا ناتھ کو صلواتیں سناتے لیکن بات وہیں تھی یعنی نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ بیکار کار کو بُرا بھلا کہتے رہے۔ مالک سے لے کر بنانے والے تک سب کو دھر لیا۔ یہ سفر ہردوار کا سفر تھا۔ ہردوار کے ساتھ ایک تقدیس وابستہ ہے۔ لوگ گناہوں کے کفارے کے لئے ہردوار جاتے ہیں۔ لیکن یہاں تو یہ سفر سفرِ آخرت بن رہا تھا۔ بہرحال یہ تجربہ شنکر کو بہت ہی مہنگا پڑا۔ ہم نے اس کی تفصیل سُن رکھی تھی۔ اس لئے جب کبھی کار کی سواری کی دعوت نتجا ناتھ سے ملتی ہم ٹال جاتے۔ ٹالنا یوں بھی ضروری تھا کہ زندگی کا معقول بیمہ کرائے بغیر اس کار میں سفر کرنا مناسب نہیں تھا۔ لیکن "لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا" کی مثل ہمیں دفتر سے چھ سات میل دور ایک ایسا مکان ملا جہاں آنے جانے کے تسلی بخش ذرائع مہیا نہیں تھے۔ ایک دن خوش گپی میں نتجا ناتھ نے پھر دعوتِ کار دی۔ روز کے آنے جانے کی صعوبتیں برداشت کی حد سے باہر تھیں ہم بھی

مان گئے لیکن صرف سفر واپسی تک ہی اقرار نامہ لکھا گیا۔

اللہ کی شان اس سفر کی مدت چند مہینوں تک محدود ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ کا یہ عذاب ہم پر کئی سال نازل رہا۔ کالے رنگ کی یہ گوڑیاسی حسین وجمیل موٹر یوں معلوم ہوتا تھا کہ آج ہی کارخانے سے بن کے نکلی ہے لیکن یہ بے پروبال کی چڑیا تھی۔ انجر پنجر ٹوٹ چکا تھا۔ انجن میں جان نہیں تھی۔ ایک دن ایک دوست نے خوب کہا تھا۔ منجا ناتھ تمہاری موٹر میں صرف دو معمولی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ موٹر نئی بن جائے گی۔ بس انجن اور باڈی بدل ڈالو۔ روز کی بک بک سے نجات پاؤ گے"۔

کتنی اچھی تجویز تھی لیکن دوست کب مانتے تھے۔ وہ اس قسم کے کایا کلپ پر راضی نہ ہوئے۔ ایک خوبی اس کار میں البتہ ضرور تھی۔ سو موٹروں میں جا رہی ہو تو اس کی آواز جداگانہ سنائی دیتی تھی۔ یوں سمجھئے ٹھمری کے ساتھ دادرا ملا ہوا ہو۔ اکبر الہ آبادی نے کہا تھا ؎

شیخ اور انجن میں فرق کچھ بھی نہیں اس میں بھک بھک ہے اس میں بک بک ہے

لیکن یہاں یہ دونوں باتیں تھیں اور مفت کی جھک جھک ان پر مستزاد۔ اس موٹر کے کئی خاص مزاج تھے۔ دھکا لگانے سے چلتی لیکن راستے میں رکتی تو پھر اچھا خاصا دم لیتی۔ ٹائر کوئی نیا نہیں تھا۔ ایک دن فالتو پہیے نے دست گیری کی اور داشتہ آید بکار کا کام دیا۔ پھٹے ہوئے ٹائر کو مرمت کے لئے دیا۔ دوسرے دن وہ تھیں فرز پہنچے۔ شام کو چلے تو دوسرے ٹائر نے دم توڑ کر پہلے ٹائر کا حق رفاقت ادا کیا۔ اب فالتو ٹائر بھی نہیں تھا۔ شاہ جی محافظِ کار بنے۔ اور باقی سب بس کے مسافر۔ اس کے بعد خود منجا ناتھ پر کیا گزری اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے۔ رات کے

ایک بجے وہ کار کو گھر تک لانے میں کامیاب ہوئے تھے۔

راستے میں ریل کے تین پھاٹک آتے تھے۔ ایک نہ ایک ضرور بند ہوتا۔ راستے کی کوفت مٹانے کے لیے کسی نہ کسی پھاٹک کے کھلا یا بند ہونے پر شرط لگائی جاتی۔ کھلا یا بند۔ یہ خاص تکیہ کلام تھا۔ دو مسافر بہ آواز بلند کہتے کھلا اور دو کہتے بند۔ رفتار کو کم و بیش کیا جاتا۔ دعائیں مانگی جاتیں۔ کئی جتن کیے جاتے لیکن ہوتا وہی جو پھاٹک والے کو منظور ہوتا۔ کبھی وہ اسے خواہ مخواہ بند رکھتا اور کبھی خلافِ قاعدہ کھول بھی دیتا۔ اس کی بے راہ روی ہماری ہار جیت کا فیصلہ کر دیتی۔

گرمیوں کے موسم میں ایک دن دو بجے بعد دوپہر کے قریب اس پھاٹک کے باہر ایک گھنٹے تک کار رکی رہی۔ مال گاڑی کے ڈبے ٹل رہے تھے۔ ہر دو چار منٹ کے بعد گاڑی آگے پیچھے جاتی۔ ایک مصیبت کا سامنا تھا۔ آخر پھاٹک کھلا۔ لیکن اب کار نہیں چلتی۔ ہینڈل سے بھی کام نہ چلا۔ ڈھلان پر لاکر نیچے کو لڑھکی تو بھی نہ مانی۔ عین ریل کی لائن پر کار رک گئی۔ اُدھر سے پھاٹک والا چلایا کہ جلدی کیجیے گاڑی آنے والی ہے۔ یارانِ سرِپل کار سے باہر کود ے اور کار کو دھکیل کر پھاٹک سے باہر لے آئے لیکن نشیب کے بعد اب فراز کی باری تھی۔ کار کو آگے دھکیلتے تو کار پیچھے کو آتی۔ جون کا مہینہ دو اڑھائی بجے بعد دوپہر کا وقت۔ لوہے کے مجسمے کو آگے پیچھے دھکیلنا۔ یہی اگر دوزخ کا عذاب نہیں تو اور کیا ہوگا۔ منتیں مانگیں۔ ماضی میں کیے گئے ہر گناہ سے توبہ کی۔ اپنے آپ کو بڑا خدا پرست ظاہر کیا۔ لیکن کار تھی کہ اللہ میاں کا حکم بنی ہوئی تھی۔ لینٹنت بر پھاٹک بند، سامنے چڑھائی، انجن محوِ خواب۔ گویا ہم جاگ رہے تھے نصیب سو رہے تھے۔ ہماری کار نے دوسروں کا راستہ بند کر رکھا تھا

دو تین ٹرک اور دو موٹریں سامنے رُکی کھڑی تھیں - ایک ٹرک کے موٹر ڈرائیور نے مشکل کشائی کی - انجن کو دیکھا اور نہ جانے کہاں سے تار دبایا کہ نبض چلنے لگی - مردہ زندہ ہو گیا - اعجازِ مسیحائی سامنے نظر آ گیا - بوکھلائے ہوئے مسافر موٹر میں بیٹھے - فرّاٹے بھرتی ہوئی چلی تو سب نے کہا کہ پیاس لگی ہے پانی تو پی لیتے دو لیکن منجا ناتھ کو نہ رُکنا تھا نہ وہ رُکے - گئے بجلی کی طرح فتح مندانہ غرور کا اظہار کرتے ہوئے - ہم نے بہت کہا کہ اس کھلونے کو بیچ ڈالیے - اس پر لاٹری ڈالیے' نیلام کیجیے' عقل کا اندھا کوئی نہ کوئی پھنس ہی جائے گا لیکن وہ نہیں مانتے - ان کا ارادہ ہے کہ اس موٹر کو کسی غیر ملکی نمائش میں بھیجا جائے بشرطیکہ سفر خشکی کا ہو اور ہم لوگ اسی موٹر میں ان کے ساتھ سفر کرنے پر آمادہ ہو جائیں - ع خدا محفوظ رکھے اس بلا سے - شاہ جی' ہم خود' ورما' کاشی ناتھ روز اس جھمیلے میں پڑتے اور روز یہ ارادہ کرتے کہ کل سے کوئی اور سلسلہ بنائیں گے لیکن مفت خوری کی چاٹ بھی بُری ہوتی ہے - جبھی تو منجا ناتھ کہہ دیتے تھے کہ پری گل فام کو چھوڑ دو تو جانوں - لیکن چند مہینے ہوئے ہم اپنی جان کو زیادہ عزیز سمجھ کر مفت خوروں کے گروہ سے الگ ہو چکے ہیں -

لیکن نہ جانے کیا حادثہ ہوا کہ اب پری گل فام تو نہیں بلکہ ان کے پاس اس کی سوت ہے - نام ابھی زیرِ تجویز ہے - مفت خورے اسی طرح چپٹے ہوئے ہیں - اس نظریے کے تحت کہ جہاں تک ممکن ہو دوسرے کی شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھانا چاہیے -